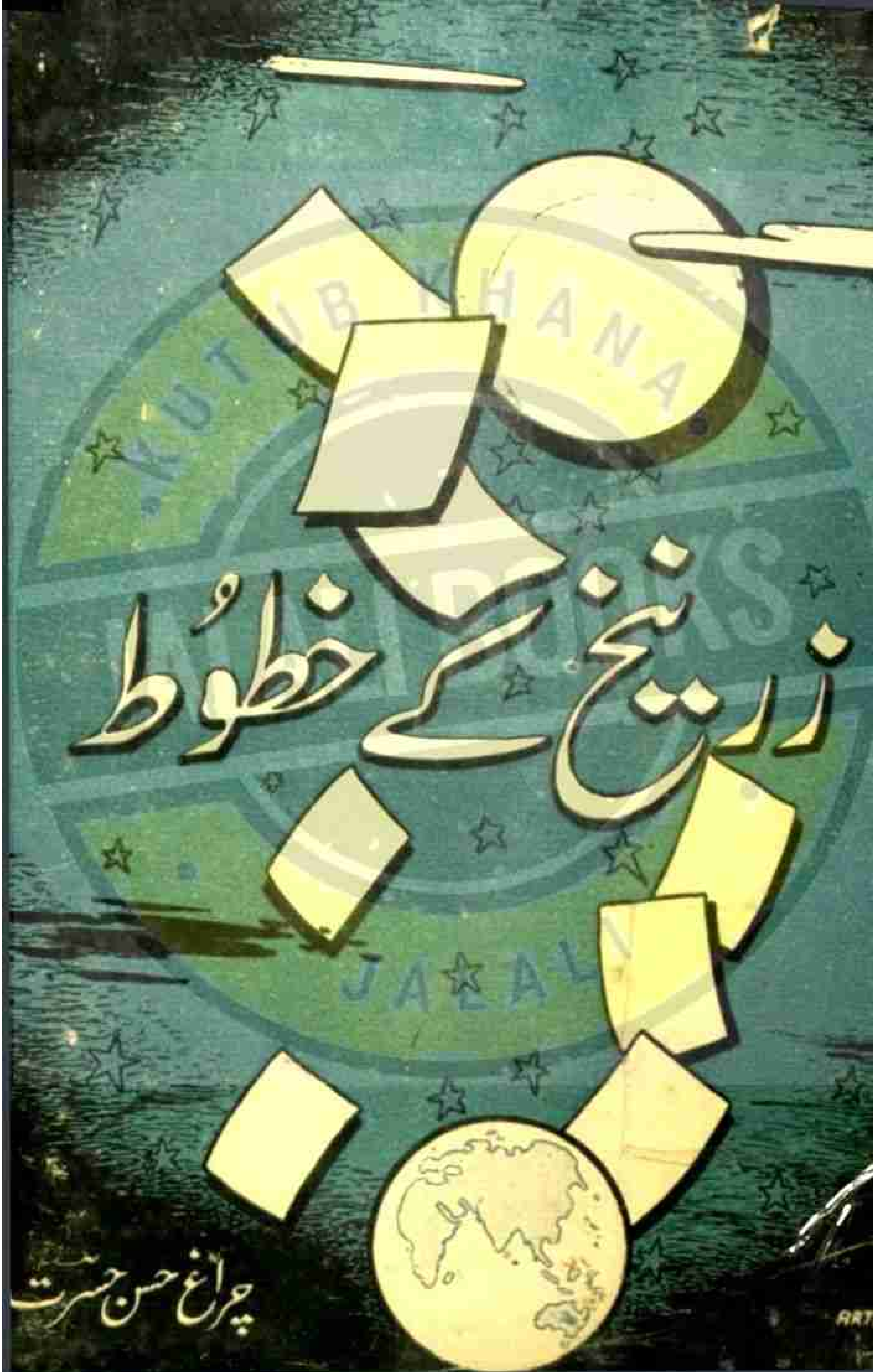

زرنیخ کے خطوط
چراغ حسن حسرت

زینب کے خطوط

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

بار اوّل مئی ۱۹۵۱ء

زبنخ کے خطوط

چراغ حسن حسرتؔ

اُردُو اکیڈمی۔ لاھور

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

فہرس

سفر ۔۔۔ ۹

اہلِ زمین ۔۔۔ ۱۹

اخبار نویس ۔۔۔ ۲۵

جھوٹ ۔۔۔ ۳۵

شاعروں اور ادیبوں کی ایک محفل ۔۔۔ ۴۹

یونیورسٹی میں ایک دن ۔۔۔ ۵۹

اسمبلی میں ۔۔۔ ۶۹

عورتوں کا جلسہ ۔۔۔ ۷۹

رُخصت ۔۔۔ ۸۹

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

دیباچہ

حسرت کو دنیا ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانتی ہے جس نے مزاحیہ کالم اخبار کے خشک مطالعے میں رنگینی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اکنافِ عالم کے افسردہ کر دینے والے حالات اور واقعات میں ان کے چھوٹے چھوٹے، تیز تیز چبھتے ہوئے فقرے کہیں کسک اور کہیں آسودگی بن جاتے ہیں۔

حسرت جب ادبی نکتہ طرازیوں سے ہٹ کر سیاسیات میں آتا ہے تو اس کے قلم کے وار بے پناہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعض ہلکے پھلکے نفسیاتی تجزیے ہمارے سیاسی کرداروں کی جیتی جاگتی بولتی تصویریں ہیں۔ پنجاب کے جغرافیے میں یہ سیاسی خاکے یوں نظر آتے ہیں جیسے ہمارے ماحول، ہمارے گرد و پیش کی مجسم ٹھوس اشیا ہوں۔ مردم دیدہ کے انہی کرداروں میں ہمیں زندگی کی گہرائیاں نظر آتی ہیں۔

”زیرنظر سفرنامہ“ پریوں کا افسانہ نہیں، دیووں کا قصہ نہیں، سیارۂ مریخ سے لے کر زمین تک کی پرواز اور پھر کرۂ ارضی کی سیر فقط سندباد جہازی کی آوارہ مزاجی اور جہاں گردی

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

زرنیخ کے خطوط

جسرت کی داستان نہیں چند حقیقتیں ہیں جنہیں طنزیہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ان حقیقتوں کو ایک اجنبی کی آنکھ سے دیکھتا ہے جو بہت دور کے دیس کا رہنے والا ہے جس کی زبان جس کی عادات، غرض زندگی کی ساری واردات ہم زمین کے باسیوں سے الگ تھلگ ہیں اس کی آنکھوں پر عصبیت کی عینک نہیں وہ واقعات کو استعجاب سے ضرور دیکھتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ تعصب کے جذبات سے پاک ہے اسلئے ایک معصوم مگر ہوشیار دیدہ ور کی طرح دیکھتا ہے اور بولتا ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے پڑھتے کہیں کہیں گلی ور کے سفرناموں کا اشتباہ ہوتا ہے اور کہیں کسی تمثیلچے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے لیکن مصنف کا قلم کبھی کبھی فرضی اجزائے داستان یوں ابھارتا ہے کہ پڑھنے والا واقعات کی دنیا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے زرنیخ کا مریخ سے چل کر کرہ ارض تک آنا اس امر کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سیاروں کی فضا میں تیزی کے ساتھ اڑتے چلے جا رہے ہیں۔

زمین کے رہنے والوں میں، عالموں، سیاستدانوں، اخبار نویسوں، شاعروں، ادیبوں سبھی کے کردار بڑے شوخ اور واضح ہیں زمین کے اس حصے کے رہنے والے کی جہاں زرنیخ آکر اترا ہے زندگی کے تمام تیور، زندگی کی ساری کشمکش ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور ہم ان تمام ناخوشگوار حقائق کو یوں گوارا کر لیتے ہیں جیسے کوئی مریض صحت کی امید پر تلخ سے تلخ دوائی کو پی لے۔

صوفی تبسم

سفر

شہر تمورخ کے رہنے والے تہریخ ابنِ سارڈس کو جس کے علم و دانش اور جمال و رعنائی کی شہرت سلورخ کے برفستانوں سے برزین کی وادیوں اور ترامید کے ریگزاروں سے بحیرۂ بلاشور کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بالطیس کے بیٹے زرینخ کا سلام پہنچے۔

اے دوست تجھے مژدہ ہو کہ میں اس ستارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جسے مریخ کے باشندے آتش و خون کی سرزمین کہتے ہیں۔ اور جس تک پہنچنے کی کوشش میں بہت سے جواں ہمت اہلِ مریخ اپنی جانیں ضائع کر چکے ہیں اے دانش مند سارڈس کے بیٹے۔ اے تہریخ۔ اے میرے دوست تم یہ جاننے کے لئے بیتاب ہو گے۔ کہ کیا یہ ستارہ سنگلاخ پہاڑوں، بے آب و گیاہ میدانوں

اور وحشت خیز بیابانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ یا اُس میں چشمے اور دریا بھی ہیں۔ نباتات بھی پیدا ہوتی ہیں۔ درخت بھی ہیں اور ان درختوں میں پھل بھی لگتے ہیں۔ ہواؤں میں پرندے۔ زمین پر انسان اور مختلف قسم کے حیوان بھی بستے ہیں۔ پھر تم یہ بھی معلوم کرنا چاہو گے۔ کہ کیا یہاں صرف شیرِ ببر اور فیلِ دنداں مخلوق آباد ہے۔ یا لمبے سینگوں والے عفریت بھی موجود ہیں۔ پھر کیا سچ ہے۔ کہ اس سیارے میں ایک آنکھ اور ایک دانت والے بونے بھی ہیں۔ جن کے حالات ہم بچپن میں بڑی بوڑھیوں کی زبانی سنا کرتے تھے لیکن پیشتر اس کے کہ میں ان باتوں کا جواب دوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر اپنے سفر کی رُوداد بیان کر دوں۔ کیونکہ جو چیز پہلے ہے۔ اُسے پہلے آنا چاہیے اور جو بعد میں۔ اُسے بعد میں۔ جیسا کہ تنوخ کے مشہور شاعر اور میرے ہم وطن فرزیل نے کہا ہے: "ہاتھی کی دم کو اُس کی سونڈ پر ترجیح مت دے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ دم سُونڈ سے کم اہم معلوم نہیں ہوتی"

جب میں تم لوگوں سے رخصت ہوا اور فرازہ نے برق کی سُرعت سے اس نیلگوں وسعت کا رُخ کیا۔ جو ہر سیارے پر چھائی ہوئی ہے۔ تو اس خیال سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہ میں نے اولوالعزمی کے جس راستے میں

قدم رکھا ہے وہ بڑا کٹھن ہے۔ شاید مجھے پھر اُن لوگوں کی زیارت نصیب نہ ہو۔ جو مجھے دوست رکھتے ہیں۔ اور جنہیں میں دوست رکھتا ہوں۔ مجھے ہیکل سلیخ کی وہ کنواریاں یاد آگئیں۔ جو سال میں ایک مرتبہ دریائے نور کے کنارے رقص کرتی ہیں۔ اور جن کی آرزو میں میں نے اور میری طرح شہر تنوخ کے ہزار ہا نوجوانوں نے بارہا ٹھنڈی سانسیں بھری ہیں۔ پھر مجھے اپنے سامنے صدفستان کی مغنیہ زرتیس کا چہرہ اُبھرتا نظر آیا جس کے حُسن میں چاندی کی لطافت ہے۔ جس کا پیراہن چاند اور سورج کی کرنوں سے بُنا گیا ہے۔ اور جس کے گیت صدفستان کے گل کدوں سے کوہِ مروارید کے سمن زاروں تک گونجے ہیں۔ کون ہے جس نے زرتیس کی ایک جھلک دیکھی ہو۔ اور اُسے بھول جائے۔ اور پھر میں بلاطیس کا بیٹا زدنیخ اُسے کیسے بھول سکتا ہوں کیونکہ زرتیس نے اپنے ہزاروں عاشقوں میں تنہا مجھے چاہا ہے مجھے اور صرف مجھے اپنی خلوت میں بار بخشا ہے۔ میرے اور صرف میرے بازوؤں پر اس کی زلفیں بکھری ہیں۔ میں نے اور تنہا میں نے اس کے رُخِ آتشیں کو بے حجاب دیکھا ہے وہ اس وقت میرے سامنے تھی۔ اس طرح میرے سامنے کہ میں چاہتا تو اُسے چھو لیتا۔ اُس کے جسم کو جو شاخِ سمن کی طرح لچکیلا اور حریر کی طرح ملائم ہے۔ لپٹا لیتا۔ لیکن میں نے اُسے چھونے کی جرأت نہیں کی۔ کیونکہ

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اُس کے ہونٹوں پر ایک عزم شکن التجا۔ نہ جانے یہ کیا عجیب و غریب جنون تھا۔ جس نے مجھے اُس سے جُدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایک نامعلوم دنیا کو دیکھنے کا جنون جس کے بارے میں ہم نے کبھی کوئی نیک بات نہیں سُنی۔ ایک دور دراز سیارے تک پہنچنے کی آرزو۔ جہاں سے ہم تک صرف ہولناک آوازیں ہی پہنچتی رہی ہیں۔ یا پھر کبھی ہمارے عالموں نے بڑی بڑی دوربینوں کی مدد سے اُس کی سطح پر شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں۔ لیکن کیا یہ خود زرتیس تھی؟ نہیں یہ اُس کی ہمزاد تھی۔ اس کی رُوح جو میرے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔ میں نے پکار کر کہا۔ اے زرتیس اے میری محبوبہ! آخر کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کیا تو چاہتی ہے کہ تیری یاد میری قوت کو سلب کر لے۔ تیری محبت میرے ارادوں کو توڑ ڈالے۔ اور میرے حوصلوں کو پست کر دے۔ تاکہ میں اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک ہو جاؤں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ کہ تو نے میرے لئے ہلاکت پسند کی ہے۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں نے اپنے وطن کے لوگوں کے لئے ایک عجیب و غریب تحفہ لانے کی خاطر یہ سفر اختیار کیا ہے۔ ایک ایسا تحفہ جو اُن کی پُرسکون زندگی میں جس کی یکسانی مار ڈالتی ہے۔ ہل چل پیدا کر دے۔ پس اگر تو چاہتی ہے۔ کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ تو جا اور میرا انتظار کر۔ کیونکہ

اِس دنیا کی کوئی کشش مجھے روک نہیں سکے گی۔ اور میں ایک نہ ایک دن تیرے پاس لوٹ آؤں گا۔ میں جب یہ الفاظ کہہ چکا تو زرتیس کا چہرہ یک بیک غائب ہو گیا۔ لیکن اس نے میرے دل میں ایک عجیب و غریب خلش سی پیدا کر دی تھی میرا جسم عرق عرق تھا۔ میرے عزم کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ میں نے صندوقچے سے عرقِ حیات کی شیشی نکال کے اس کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے۔ اُس کے اثر سے میری توانائی پھر عود کر آئی۔ اور سرور و لذّت کی ایک لہر سی مجھے قلب کی طرف اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔

تم جانتے ہو فرارہ ایک ایسا آلہ ہے۔ جس میں اِنسان کی طرح سمت و جہت کا شعور موجود ہے۔ اور تنہا جہت کا شعور ہی نہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ خطرہ کہاں ہے۔ اور اُس سے کیونکر بچ کر نکلنا چاہیے۔ وہ بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہے بیرونی دنیا سے بے نیاز۔ اُس میں تازہ ہوا کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ایک چھوٹا سا قمقمہ جو انسان کے پھیپھڑے سے مشابہ ہے۔ کثیف ہوا کو ایک سوراخ کے ذریعے باہر نکال دیتا ہے۔ پھر اُس پہ موٹے موٹے فولادی شیشوں کا خول چڑھا ہوا ہے۔ جو باہر کی کسی چیز کو اندر داخل ہونے نہیں دیتا۔ ہاں تم اُس میں بیٹھے بیٹھے گرد و پیش کی چیزوں کو بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ اب میرا فرارہ نیلگوں وسعتوں میں

موجِ نور کی طرح یکسا چلا جا رہا تھا۔ اور دہنے بائیں اجرامِ فلکی قندیلوں کی طرح چمک رہے تھے ہر طرف چھوٹے بڑے کُرّے پھیلے ہوئے تھے۔ انبوہ در انبوہ کارواں در کارواں۔ تاباں و درخشاں رواں دواں۔ اس طرح تو بر تو درجہ بدرجہ حلقہ بحلقہ جس طرح ایک گنبد کے اوپر دوسرا گنبد چن دیا گیا ہو۔ اور اس سب پر ایک غبارِ سیمیں چھایا ہوا تھا۔ نہ معلوم یہ جادۂ کہکشاں تھا۔ یا کوئی اور مقام جس کا نام ہماری دنیا کے لوگوں کو معلوم نہیں۔ بہر حال اس گذرگاہِ نور میں کچھ ایسی کشش تھی کہ قدم قدم پر ٹھہر جانے کو جی چاہتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے سامنے گدرائے ہوئے جسم ہیں۔ عریاں بازو۔ شاخِ مرجان کی سی پتلی پتلی سرخ انگلیاں سیاہ ابروؤں کے تلے سُرمگیں آنکھیں اور وادیٔ پُر امید کے لالۂ صحرا کے سے لال لال ہونٹ۔ ہمہ نشاط و ہمہ مستی۔ پھر یکبارگی بربط کی صدائیں گونج اٹھیں۔ فضا کے ہر گوشے سے گیت اُبھرتے معلوم ہوتے اور کان نغموں سے بھر جاتے۔ معلوم نہیں یہ میری نگاہ کا فریب محض سیمیائی نمود یا واہمہ کی خلاقی۔ بہر حال میں اب تک اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کہ جو کچھ میں نے دیکھا۔ وہ سچ مچ موجود تھا۔ اور جو کچھ میں نے سنا وہ اُن نغموں کی صدائے بازگشت کے سوا کچھ اور تھا۔ جو میرے

قلب سے اُبھرے اور ہونٹوں تک نہ پہنچ سکے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس
کیفیت میں مجھے کتنی مدت گزری۔ کتنی بار سورج چھپا۔ اور رات کی زلفیں
بکھریں۔ کتنی بار صبح نے اپنی سنہری انگلیوں سے مشرق کے پھاٹک کھول دیئے
اور اس کا نفس بھر دتم لوگوں پر موجِ نسیم بن کے چھا گیا۔ تم لوگوں نے وقت
کو ناپنے کے جو پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سے میں نے کام لینا چھوڑ دیا تھا
کیونکہ وقت بحرِ بیکراں ہے۔ اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ نہ آغاز ہے نہ انجام اور
اُسے ناپنے کی کوشش رائیگاں ہے۔ ہاں میں نے سینکڑوں بار اپنے گرد تاریکی
دیکھی سینکڑوں مرتبہ نور کو محیط پایا۔ نہ میرے سونے کا کوئی وقت معین تھا۔ نہ
جاگنے کا۔ نیند آتی تھی۔ تو سو جاتا تھا۔ پھر خود بخود جاگ اُٹھتا تھا۔ بھوک لگتی
تھی تو وہ ٹکیہ کھا لیتا تھا جس کی دس شیشیاں مجھے حکیم آلبین نے چلتے وقت
دی تھیں۔ جب فضائے لاہوت کو روشنی کی پہلی کرن چھوتی۔ تو میں ایک
ٹکیہ کھا لیتا۔ اور جب تک روشنی کی آخری کرن غائب نہ ہو جاتی مجھے بھوک
نہ لگتی تھی۔ پیاس بجھانے کے لئے عرقِ حیات کے دو قطرے کافی ثابت ہوتے
تھے۔ اور واقعہ ہے کہ اتنے طویل سفر کے باوجود میں اپنے آپ میں جو توانائی
پاتا ہوں۔ وہ محض عرق حیات کے باقاعدہ استعمال کا نتیجہ ہے۔ سفر کے

آخری ایام میں ایک سخت سانحہ پیش آیا۔ فرآرہ گرم پرواز تھا۔ اور میں اُونگھ رہا تھا یک بیک مجھے فراٹے کی سی آواز سنائی دی۔ اور میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چھوٹا سا کرہ تیزی سے فرآرہ کی جانب لپکا چلا آرہا ہے۔ مجھے لمحہ بھر کے لئے فضا میں موت کا ہولناک چہرہ اُبھرتا نظر آیا۔ اور اس کی سخت انگلیوں کی گرفت میں نے اپنی گردن پر محسوس کی۔ یک بیک مجھے ایک شور سا سنائی دیا۔ میں نے گردن موڑی تو دیکھا کہ ایک اور کرہ جو جسامت میں قریب قریب اتنا ہی بڑا تھا مخالف سمت سے تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ قبل اس کے کہ میں ان دو عفریتوں سے بچنے کی کوشش کروں وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر اس زور سے آپس میں ٹکرائے کہ ان کے ٹکڑے ہر طرف فضا میں بکھر گئے۔ یہ بڑے بڑے شہاب ثاقب تھے۔ جو یونہی گردش کرتے۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے اور ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔

میں اب اپنی منزلِ مقصود کے قریب تھا۔ اور ہر لمحہ اس سے قریب تر ہوتا چلا جاتا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اس کے خدوخال زیادہ واضح اور نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ پہلے مجھے اس پر جو داغ سے نظر آتے تھے۔ اب انہوں نے پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ جو دھاریاں سی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ

دریا تھے۔ اُس کے زیادہ تر حصّے پر ایک چادر سی پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ تری ہے۔ جو اِس سیّارے کی تین چوتھائی پر پھیلی ہوتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے دُوربین کی مدد سے خشکی پر شہروں کی اونچی اونچی عمارتیں اور سمندروں میں جہاز نظر آنے لگے۔ اب میں جوں جوں اس سیّارے کے قریب آتا جاتا تھا۔ فرآدہ کی رفتار ہلکی کرتا جاتا تھا۔ تاکہ زمین سے ٹکرا جانے کا اندیشہ نہ رہے۔ تاآنکہ میں اُس کے اِس قدر قریب پہنچ گیا کہ شہر کے گلی کوچوں میں لوگ چلتے پھرتے نظر آنے لگے

اہلِ زمین

سارڈس کے بیٹے توبیخ کو زرنیخ ابنِ بلاطیس کا سلام پہنچے۔ اے دوست میں نے اس تھوڑے سے عرصے میں جو کچھ دیکھا اور سُنا ہے وہ ان تمام باتوں سے عجیب تر ہے۔ جو مریخ کے باشندوں کو پیش آچکی ہے۔ یا جنہیں ہمارے وطن کے دانش مندوں نے تصوّر کی آنکھ سے دیکھا اور تخیّل کی مدد سے سوچا ہے۔ اور جب میں ان حیرت انگیز باتوں پہ غور کرتا ہوں۔ تو دانش مند فرزیل کے یہ اشعار میری زبان پہ آجاتے ہیں ؂

اگر تحیر کی زبان ہوتی — تو نہ جانے وہ کیا کہتا
اگر استعجاب چیخ سکتا — تو عقل پہ کیا گذرتی

تو اے تونیخ اے میرے دوست۔ اگر میرا خط تجھے مل گیا ہے تو تجھے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ جب میں زمین پر اترا تو میں نے اپنے آپ کو دو گروہوں کے درمیان پایا۔ ایک طرف بڑے بڑے عمامے اور لمبی لمبی ٹوپیاں تھیں۔ دوسری طرف گھٹے ہوئے سر کرتے اور رنہ بند دونوں مجھے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور میں حیران تھا۔ کہ کیا کروں۔ اتنے میں ان کے درمیان ایک خوفناک لڑائی شروع ہو گئی۔

تمہیں حیرت ہو گی۔ کہ یہ کون لوگ تھے۔ اور میرے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ مجھے خود بھی اس واقع پر حیرت تھی۔ لیکن اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔ اصل بات ہے۔ کہ زمین کے جس حصے میں میرا فرآرہ اترا ہے۔ وہ مختلف گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ جو زندگی اور زندگی کے بعد کے معاملات میں سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ میرے اور تمہارے لئے یہ چیز بجائے خود معمہ ہے۔ کہ حیات اور مابعد الحیات کے متعلق کوئی اختلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تو زندگی ہو یا زندگی سے بعد کے معاملات ہمارے نزدیک سب کے سب اتنے واضح اور غیر مبہم ہیں۔ کہ ان کے بارے میں الگ الگ رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن میرے دوست کرۂ ارض کے باشندے میری اور تمہاری طرح نہیں سوچتے۔ ان کا انداز نگاہ اور ہے۔ سوچنے

کا ڈھنگ اور۔ انہیں ہر بات میں پیچیدگیاں پیدا کر لینے کا خاص سلیقہ ہے۔ وہ کسی عجیب طریقے سے جو ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بڑی سیدھی سادھی چیزوں کو پیچیدہ بنا لیتے ہیں۔ اور یہ چیز ان لوگوں کے نزدیک بہت بڑا ہنر ہے چنانچہ ان کے بڑے بڑے دانش مندوں نے زندگی کی مختلف تعبیریں کر کے انہیں اچھا خاصا گورکھ دھندا بنانے میں ساری عمریں صرف کر دی ہیں۔

یہ لوگ جن کی لڑائی کا تماشا میں نے دیکھا۔ دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے عقیدوں میں بڑا اختلاف ہے۔ لیکن ان دونوں کے ہاں اس قسم کی روایتیں چلی آتی ہیں۔ کہ جب ان کے مصائب حد سے گزر جائیں گے۔ تو ایک شخص آسمان سے اُترے گا۔ تو اُن کے دشمنوں کو کچل ڈالے گا۔ اور ان کے سارے دکھوں کو دور کر دے گا۔ ان دونوں گروہوں نے مجھے غلطی سے وہی شخص سمجھا۔ جس کا ذکر اُن کی پرانی کتابوں میں موجود ہے۔ معلوم نہیں۔ ان دونوں گروہوں کے ہاتھوں مجھ پر کیا گزر جاتی۔ لیکن شورش کے حکومت کے کارندے یعنی پولیس کے لوگ موقع پر پہنچ گئے۔ اُن کے آتے ہی لڑائی رک گئی۔ اور مجھے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا۔

کرۂ ارض اور مریخ کے درمیان بڑی مشابہت ہے۔ یہاں بھی ہمارے وطن

کی طرح پہاڑ۔ دریا اور سمندر موجود ہیں۔ یہاں کے باشندوں کی شکل و صورت بھی ہم سے چنداں مختلف نہیں۔ البتہ ان کے جسم ہماری طرح شفاف نہیں پھر وہ عقل و دانش میں بھی ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ اور قدرت کے بہت سے اسرار جنہیں ہم معلوم کر چکے ہیں۔ ان کے لئے ابھی تک سربمہر کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی بے خبری اور جہالت پر مجھے حیرت بھی ہوئی۔ اور افسوس بھی آیا۔ ان کی حالت بچوں کی سی ہے۔ جو دو قدم چلتے ہیں۔ اور گر پڑتے ہیں۔ اور وہ دو قدم چل کے گر پڑنے کو ہی بہت بڑا کمال سمجھتے ہیں۔

میں جن دو جماعتوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ ان سے میں اپنے آپ کو ابھی تک محفوظ نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ان دونوں گروہوں نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری یہ دونوں مجھ سے اپنا تعلق ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ گزشتہ چند دنوں میں ان کے درمیان کئی مرتبہ فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دنیا کے جس حصے میں میں اترا ہوں۔ اس کا نام ہندوستان ہے۔ اس سرزمین کے باشندوں کے خیالات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ تو تمہیں ہو گیا ہوگا لیکن عجیب بات یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کی رنگت۔ لباس اور زبان میں بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک علاقے کا باشندہ دوسرے علاقے کے لوگوں

کی بولی نہیں سمجھ سکتا۔ تم حیرت زدہ ہو کے پکار اُٹھو گے۔ کہ یہ کیونکر ممکن ہے لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسے میرا اور تمہارا استعجاب نہیں بدل سکتا۔ اور یہ معاملہ صرف ہندوستان ہی پر موقوف نہیں۔ اس سیارے کے مختلف حصوں میں اسی قسم کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ لباس الگ۔ خیالات الگ۔ نظامِ حکومت مختلف۔ پھر ہزاروں بولیاں ہیں۔ جو چھوٹے چھوٹے علاقوں بولی جاتی ہیں۔ یہ ضرور ہے۔ کہ ہندوستان میں ایک بولی ایسی ہے۔ جو ملک کے اکثر حصوں میں سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان بہت آسان ہے۔ چنانچہ میں نے سات دن کی قلیل مدت میں اتنی سیکھ لی ہے۔ کہ اپنا کام چلا لیتا ہوں۔ اور جہاں زبان ساتھ نہیں دیتی۔ وہاں اشاروں سے کام نکل جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو حیرت ہے۔ کہ میں نے ان کی زبان اس قدر جلد کیونکر سیکھ لی۔ لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے وہ میں کرۂ ارض کا نہیں۔ بلکہ مریخ کا باشندہ ہوں۔ میرے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ کوئی ایچ پیچ نہیں۔ میں پھولوں کی زبان سمجھتا ہوں۔ گریۂ شبنم۔ اور تبسمِ برق کے معنی جانتا ہوں۔ کرنوں کی نگاہوں میں جو غمزے پنہاں ہیں ان سے واقف ہوں۔ بجلی کی لکیروں میں جو اشارے پوشیدہ ہیں۔ اُن سے بھی آگاہی رکھتا ہوں۔

اخبار نویس

تو یخ جب سے میں زمین پر اترا ہوں۔ لوگوں کے لیے تماشہ بن کے رہ گیا ہوں۔ یعنی ہر شخص مجھ سے ملنے اور میرے حالات معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ چنانچہ میں جس مکان میں ٹھیرا ہوں اس کے سامنے سینکڑوں آدمی مجھے ایک نظر دیکھنے کے لئے کھڑے رہتے ہیں۔ شکر ہے کہ اس مکان کے گرد پولیس کا پہرہ لگا ہے۔ ورنہ معلوم نہیں مجھ پر کیا گزر جاتی۔ اور حکومت نے میری حفاظت کا اتنا انتظام کر رکھا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح میرے وجود کو بہت قیمتی سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ اُسے نقصِ امن کا اندیشہ ہے۔ یہ اندیشہ نہ ہوتا۔ تو غالباً مجھے چڑیا گھر

بھیج دیا جاتا۔ اس عام توجہ اور دلچسپی نے میری زندگی کو اچھی خاصی مصیبت بنا دیا ارات دن بستر پر پڑے چھت کو گھورتے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ کھلی ہوا میں سانس تک لینے کا موقع نہیں ملتا۔ اور کھلی ہوا میں سانس لینا درکنار۔ مدت سے میں نے آسمان تک نہیں دیکھا۔ مکان کے صحن میں قدم رکھنا ممنوع ہے۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ ادھر کھڑکی میں میرا چہرہ نظر آیا۔ ادھر اخبار والوں نے تصویر اتار لی۔

ان اخبار والوں نے تو خاص طور پہ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تم جانتے ہو اخبار کیا ہوتا ہے۔ آج سے پانچ سو سال پہلے ہمارے ہاں بھی اخباروں کا رواج تھا لیکن اب ان کا ذکر صرف تاریخ کی پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔ یا ترمید کے عجائب خانے اور شکاکیہ کی لائبریری میں پرانے اخباروں کے چند نمونے نظر آجاتے ہیں اور ایک اخبار کا کیا ذکر ہے اس سرزمین میں بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے ہاں ہزار پانسو سال پہلے موجود تھیں۔ اور اب بالکل معدوم ہو چکی ہیں۔ یہ اخبار والے پولیس کے پہرے کے باوجود کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک اخبار والا کمرے کے ایک کونے میں چھپا بیٹھا ہے دوسرا پلنگ کے نیچے لیٹا ہے۔ تیسرا چھت پر اور چوتھا کھڑکی کے ساتھ لگا

کھڑا ہے۔ اب چاہے آپ کتنا چیخئے چلائیے۔ ڈرائیے۔ دھمکائیے۔ کیا مجال کہ یہ لوگ ٹس سے مس ہوں۔ مجھ پر تو ان لوگوں کا ایسا رعب چھایا ہے کہ کرسی پر بیٹھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اس کے ہر پائے سے ایک ایک اخبار والا لپٹا کھڑا ہے۔ چائے ایک پتی ہے جسے یہاں کے لوگ اُبال کے اور دودھ ملا کے پیتے ہیں۔ میں بھی ان کی طرح صبح کو چائے پیتا ہوں۔ لیکن جب چائے کی پیالی اٹھاتا ہوں۔ تو اس خیال سے کانپ اُٹھتا ہوں۔ کہ کہیں پیالی میں کوئی اخبار والا چھپا نہ بیٹھا ہو۔ دوپہر کو کھانا آتا ہے۔ تو پلیٹ کو ہاتھ لگاتا ڈرتا ہوں یہ ممکن ہے کہ بھنے ہوئے مرغ کی جگہ اخبار والا نکل آئے اور یہ لوگ کیا کرنے آتے ہیں۔ محض میرا حال معلوم کرنے۔ لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب انہوں نے اشاروں میں مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا تو میں اس طرح چپکا کھڑا رہا۔ جیسے میں نے اُنہیں دیکھا ہی نہیں۔ کل شام پہلی مرتبہ میں نے ان لوگوں سے باتیں کیں میں خود بھی چاہتا تھا کہ اپنے متعلق اخباروں میں ایک بیان چھپوا دوں تاکہ لوگوں میں جو اضطراب سا پایا جاتا ہے۔ وہ ختم ہو جائے۔ اور حکومت بھی اس روز روز کے جھگڑے سے اُکتا گئی ہو گی۔ میرا بس چلتا تو پہلے ہی دن اپنے متعلق اخباروں میں بیان چھپوا دیتا۔

لیکن اشاروں کے سوا اظہار خیال کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ اور تم جانتے ہو کہ اشاروں میں غلط فہمی کا بڑا احتمال ہے۔ کل شام میرے کمرے میں اخبار نویسوں کے گنجے سروں اور عینکوں کے سوا اور کسی چیز پر نظر نہیں پڑتی تھی۔ پہلے وہ دیر تک آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر ان میں سے ایک شخص جو ایک آنکھ سے کانا اور ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کہا "میں ایک ستیارے سے آیا ہوں۔ جسے آپ لوگ مریخ کہتے ہیں۔"

"آپ کا اسم شریف۔"

"زرنیخ — زرنیخ — ابن بلاطیس۔"

"آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں۔"

"یہ تو عجب مہمل سوال ہے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"ہم لوگ تو اخبار نویس ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم آپ کے حالات معلوم کرنے آئے ہیں۔"

میں نے کہا: "میں اگرچہ اخبار نویس نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ میں آپ لوگوں کے حالات معلوم کرنے آیا ہوں"

"بہت خوب بہت خوب! کیا آپ کے وطن میں آپ جیسے اور لوگ بھی ہیں؟"

"کیا آپ کے وطن میں آپ جیسے اور لوگ بھی ہیں؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔"

"تو میرا بھی یہی جواب ہے۔"

ایک قہقہے کی صدا بلند ہوئی۔ اور وہ شخص خفیف ہو کر رہ گیا۔ پھر کہنے لگا "گویا مریخ میں آبادی ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی ذہانت قابل داد ہے۔ کہ آپ نے ایسی آسانی کے ساتھ ایک پیچیدہ سوال حل کر لیا۔"

لوگ پھر ہنسنے لگے۔ وہ شخص بولا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا جسم اتنا شفاف کیوں ہے؟"

میں نے کہا: "اس لئے کہ میرا جسم شفاف ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"آپ کا جسم کیوں غیر شفاف ہے"

"میں اس سوال کا کیا جواب دے سکتا ہوں"

"تو آپ اس قسم کا سوال مجھ سے کیوں کر رہے ہیں"

اب ایک اور شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا "ہم آپ سے اس امر کی وضاحت اس لئے چاہتے ہیں کہ اگر یہ صاحب جو ابھی ابھی آپ سے سوال کر رہے تھے کس طرح مریخ میں جا پہنچیں تو وہاں کے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ کہ کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک ٹانگ سے لنگڑے اور ایک آنکھ سے کانے ہیں"۔ اس پہ زور کا ایک قہقہہ لگا۔

میں نے کہا اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا مریخ کے تمام باشندوں کے جسم یونہی شفاف ہوتے ہیں تو اس کا جواب اثبات میں ہے وہ شخص میرا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ اور اب ہر طرف سے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ ان کے جواب میں میں نے جو کچھ کہا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ہم مریخ کے باشندے تعداد میں آپ سے زیادہ اور علم میں آپ سے کہیں

بڑھ کے ہیں۔ ہم نے زمان و مکان کی حدبندیوں کو مٹا دیا ہے۔ اور عناصر کو پوری طرح اپنا تابع بنا لیا ہے۔ ہم نہ تو سست رفتار گاڑیوں اور موٹروں پر سفر کرتے ہیں۔ اور نہ آپ کی طرح تار۔ ٹیلیفون وغیرہ کے محتاج ہیں۔ بلکہ ہم پلک جھپکتے میں سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں جن لوگوں کے مابین بظاہر ہزاروں میلوں کا فاصلہ ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بالمشافہ گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہم میں نہ کوئی ننگا اور بھوکا ہے۔ نہ کوئی مفلس اور محتاج ہے۔ نہ ہم ایک دوسرے سے کوئی عداوت رکھتے ہیں نہ ہم میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں پورا پورا امن ہے ہاں کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے۔ کہ کوئی عورت ہم میں سے کسی کی روح میں شورش اور اضطراب پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے اس سے ہمارے سیارے کے امن و سکون پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے ہمارے ہاں الگ الگ بادشاہتیں اور حکومتیں نہیں۔ الگ الگ بولیاں نہیں۔ ایک ہی زبان ہے جو سارے سیارے میں بولی جاتی ہے۔ ایک ہی نظام حکومت ہے جس میں یہ پورا سیارہ منسلک ہے۔"

میں نے ان لوگوں کے سامنے جو تقریر کی اس میں ٹیلیفون۔ تار۔ موٹر

گاڑی وغیرہ الفاظ آ گئے ہیں۔ یہ رسل و رسائل کے ذرائع ہیں۔ جو آج سے چھ سات سو سال پہلے مریخ میں رائج تھے۔ مریخ کی زبان میں انہیں "زردان" کہتے تھے۔ سیڈوش کبیر کی بہترویں جلد میں ان کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ ترامید کے عجائب خانے میں اب بھی ان کے نمونے ملتے ہیں۔

آج صبح کے اخباروں میں میرے حالات تصاویر کے ساتھ چھپ گئے ہیں لیکن یہ دیکھ کے میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ کہ ایک اخبار نے مجھے مریخ کے بادشاہ کا بیٹا لکھا ہے۔ دوسرے نے لکھا ہے۔ کہ زرنیخ کو محبت میں ناکامی ہوئی اس لئے وہ مریخ کی سکونت ترک کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ایک اور اخبار کا بیان ہے۔ کہ مریخ کے لوگ ہوا پھانک کے گزارہ کرتے ہیں۔ میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک مشہور شاعر حاکم شہر کا اجازت نامہ لے کے مجھ سے ملنے آگیا۔ میں نے اُسے اخبار دکھا کے کہا۔ کہ تم اسے کیا کہتے ہو۔ وہ کہنے لگا۔ کیا آپ نے یہ باتیں نہیں کہیں۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ وہ کہنے لگا۔ تو اخبار والوں نے جھوٹ لکھا ہے۔ میں نے پوچھا جھوٹ کیا ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگا۔ ایسی بات جو اصلیت نہ رکھتی ہو۔ میں نے متعجب ہو کے پوچھا۔ لیکن اصلیت کے خلاف کوئی بات کیونکر کہی جا سکتی ہے وہ کہنے لگا۔ کیوں نہیں کہی جا سکتی۔ ہم سب کو جھوٹ بولنے

پر قدرت حاصل ہے۔ اور اگرچہ ہم سب جھوٹ کو بہت بڑی برائی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے بچ نہیں سکتے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں۔ جو جھوٹ سے خالی ہو۔ اور در اصل اُس نے ہماری زندگی میں بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں۔ کہ اگر ہمیں جھُوٹ بولنے پر قدرت نہ رہے۔ تو ہماری زندگی بالکل بے کیف ہو کر رہ جائے۔

میں سمجھتا تھا۔ کہ کرۂ ارض کے باشندے مجھے کوئی نئی بات سکھا نہیں سکتے اُن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں۔ جو ہمارے پاس موجود نہ ہو۔ لیکن اب تو مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کیونکہ ان کے پاس جھُوٹ ہے۔ جو ہمارے پاس نہیں۔ در اصل ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ کہ ہم جھُوٹ بولنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ میں پچھلے چند دنوں سے جھوٹ بولنے کی مشق کر رہا ہوں۔ اس میں ایک ناقابلِ بیان لذّت ہے۔ ایک حیرت انگیز آسودگی۔ قسم ہے۔ اس نیلگوں وسعت کی۔ کہ تر امید کی وادیوں میں کوئی پھل ایسا نہیں۔ جو شیرینی میں جھُوٹ کا مقابلہ کر سکتا ہو۔

جھوٹ

تو یہ ایک دلچسپ واقعہ سنو۔ میں نے جس قدر جلد یہاں کی بولی سیکھ لی ہے۔ اس پر سب کو حیرت ہے۔ ہفتے بھر کے اندر میرا یہ حال تھا کہ ان لوگوں کی باتیں سمجھ لیتا تھا۔ اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مطلب ادا کر دیتا تھا مہینہ بھر کے اندر اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ یہاں کی زبان فر فر بولنے لگا۔ اور اب تو یہ عالم ہے کہ بڑی بڑی ضخیم کتابیں پڑھ لیتا ہوں۔ لکھنے کی بھی تھوڑی بہت مشق ہو گئی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ مجھے ان لوگوں کا لب و لہجہ میسّر نہیں۔ بعض بعض خاص آوازوں کو ان لوگوں کی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ہم لوگوں کے حلق کی ساخت کسی قدر مختلف ہے۔ ہاں یہ تو میں تمہیں

بتانا بھول ہی گیا۔ کہ میں نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں بڑی سخت محنت کرنی پڑی۔ بہت وقت بھی صرف ہوا۔ پھر بھی میں اس معاملے میں زیادہ مطمئن نہیں۔ یعنی جس آسانی سے ہندوستانی زبان بول لیتا ہوں۔ اُسی آسانی سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اصل میں جھوٹ بولنا بڑا مشکل فن ہے۔ اہلِ زمین کے لئے تو نہیں۔ کیونکہ جھوٹ ان کا روزمرّہ کا مشغلہ ہے لیکن ہمارے تمہارے لئے بڑا مشکل ہے۔ پھر خود یہاں کے لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ بھدّی قسم کا جھُوٹ تو ہر شخص بول لیتا ہے لیکن لطیف قسم کا جھوٹ یعنی ایسا جھُوٹ جو بظاہر سچ معلوم ہو۔ خاص خاص لوگوں کا حصّہ ہے۔ شاعر۔ ادیب اور اخبار نویس اس فن میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ سیاست داں بھی ایسے ایسے جھُوٹ تصنیف کرتے ہیں۔ جن کی لطافت پر روح وجد کرتی ہے شکر ہے کہ مجھے اُستاد بھی ایسا ہاتھ آیا ہے۔ جو اس ہنر میں یگانہ ہے یعنی وہ شاعر بھی ہے۔ اخبار نویس بھی۔ افسانے بھی لکھتا ہے۔ سیاست سے بھی واسطہ رکھتا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں ایسی ہیں۔ جن میں جھوٹ کے بغیر دو قدم چلنا مشکل ہے۔ کبھی کبھی اس کی باتیں سنتا ہوں۔ تو افسوس ہوتا ہے۔ کہ اتنی زندگی گزر گئی لیکن جھوٹ سے بیگانہ ہی رہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ہماری تمہاری اکثر ناکامی

کی وجہ جھوٹ سے بیگانگی ہے۔ مثلاً تمہیں یاد ہے کہ زرتمیں ایک دفعہ مجھ سے ایسی بگڑی ایسی بگڑی کہ مہینوں پیام و سلام کا سلسلہ بند رہا۔ بہتیری منتیں خوشامدیں کیں لیکن اُسے تو میری صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ آخر فرزیل شاعر سے سفارش کروائی۔ تو قصور معاف ہوا۔ اب سنو عتاب کی وجہ کیا تھی۔ ایک دن چاندنی رات میں میں اور وہ صدفستان کے چمن فیروزہ رنگ میں بیٹھے تھے ہوا میں سلاّل کے پھولوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ اور سامنے دریائے نور موج مار رہا تھا۔ یک بیک وہ کہنے لگی۔ زرنیخ میرے دوست! کیا تم نے میرے سوا کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ میں نے کہا: زرتمیں! میری محبوبہ اگرچہ میں نے جس طرح تمہیں چاہا۔ اس طرح کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ لیکن آج سے چند برس پہلے ایک اور عورت نے بھی میرے دل میں گداز پیدا کر دیا تھا۔ وہ بیتاب ہو کے پوچھنے لگی وہ کون تھی۔

میں نے کہا: زریہ کی بیٹی لالان۔"

وہ چلاّ کے بولی۔ تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے زریہ کی بیٹی سے بھی محبت کی ہے۔ اُس آبرو باختہ عورت سے بھی محبت کی ہے۔ جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ عشق و وفا کسے کہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ میری محبوبہ! مجھ سے یہ قصور ضرور ہوا ہے لیکن یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب میں تجھے جانتا بھی نہیں تھا۔

وہ بولی۔ اے زرنیخ۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔

میں نے جواب دیا تم اپنی جگہ حسین ہو۔ لالاں اپنی جگہ حسین ہے۔ اس کا حُسن صرف آنکھوں کو تسکین دے سکتا ہے۔ اور تمہارے حُسن نے میری رُوح کو بھی تسکین بخشی ہے۔

وہ جھلّا کے بولی۔ تم جس طرح اُس کی تعریف کر رہے ہو۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب بھی تمہارے دل میں اُس کی جگہ ہے۔

میں نے کہا۔ میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن ابھی تک اُن لمحوں کو بھلا نہیں سکا۔ جو میں نے اس کی محبت میں بسر کئے ہیں۔

یہ سنکر اُس کی آنکھوں سے مارے غصّے کے شعلے نکلنے لگے۔ اور وہ اس طرح فریاد کرنے اور اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔ کہ میں ڈر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان کئی مہینوں کے لئے مفارقت ہوگئی۔ اور اگرچہ فرزیل کی سفارش سے اس نے مجھے معاف کر دیا لیکن اس کے دل سے یہ بات نہیں نکلی۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہوتا کہ جھوٹ بھی کوئی ایسی چیز ہے

جس سے اس موقع پر کام لیا جا سکتا ہے۔

تو جب اُس نے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ میں کہہ سکتا تھا۔ نہیں زرنمیس جب تک میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا۔ کہ عشق کسے کہتے ہیں۔ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ اگر کہتی کہ میں نے سنا ہے۔ لالاں سے تمہاری ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ تو میں ایک قہقہہ لگا کے کہتا۔ لالاں کون۔ وہی زریر کی بیٹی کیا کسی تصور میں یہ بات آسکتی ہے۔ کہ زریخ ایسی لڑکی سے محبت کر سکتا ہے۔

وہ لالاں کے حسن کے متعلق پوچھتی۔ تو میں کہتا۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ زرنمیس! شاید تم لوگ لالاں کو حسین سمجھتے ہو۔ لیکن میرے نزدیک تو وہ قطعی طور پر بدصورت ہے۔ اور یقین کرو یہ باتیں سن کے اسے میری طرف سے بالکل اطمینان ہو جاتا۔ کیونکہ عورت کو جھوٹ سے بآسانی رام کیا جا سکتا ہے۔ میں زمین پر مردوں اور عورتوں کو رات دن جھوٹ بولتے دیکھتا ہوں اور دونوں اس کوشش میں ہیں کہ اس مقابلے میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جھوٹ مرد کے لئے تلوار ہے۔ اور عورت کے لئے قیمتی زیور۔ میں نے مردوں اور عورتوں کو سب سے پہلے ایک ضیافت میں

اس فن کی مشق کرتے دیکھا۔ضیافتیں ہمارے یہاں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کا انداز اور ہوتا ہے۔ مقصد بھی مختلف۔ یہاں کی ضیافتوں کا انداز اُن سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں تو لوگوں کو ضیافتیں کرنے اور ضیافتوں میں شریک ہونے کے سوا اور کوئی بات سوجھتی ہی نہیں۔ اور میرا تو خیال ہے کہ یہ لوگ ضیافتیں کرنے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی شادی ہوئی ہے۔ اب اس کے لئے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے بھائی بندوں عزیزوں رشتے داروں دوستوں جان پہچان کے لوگوں کی دعوت کر ڈالے۔ اور غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں شادی اسی ضیافت کا نام ہے۔ ہمارے ہاں اگر عورت اور مرد اکھٹے زندگی بسر کرنے کا پیمان باندھ لیں۔ یہ پیمان گواہوں کے سامنے باندھا جائے اور اس کا اعلان کر دیا جائے تو۔ قانون کی نظر میں وہ میاں بیوی ہیں۔ لیکن یہاں میاں بیوی بننے کے لئے صرف اسی قدر کافی نہیں۔ ضیافت کرنا بھی ضروری ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ضیافت نہ کی جائے تو لوگ شور مچا دیں اور یہ تعلق "ناجائز" سمجھا جائے۔ گویا شادی کے موقع پر جو ضیافت ہوتی ہے وہ لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ میرا صرف خیال

ہی خیال ہو۔ لیکن میں نے ابھی تک نہیں دیکھا کہ ضیافت کے بغیر کوئی شادی ہوئی ہو۔ کوئی شخص مرجائے تو اس کے وارث کے لئے کچھ لوگوں کو کھانا کھلانا ضروری ہے ممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ مال متروکہ میں ہر شخص اپنا حقہ لگانا چاہتا ہے۔ پھر یہ بھی رسم ہے۔ کہ جب کوئی شخص سفر پر جاتا ہے۔ تو اس کے اعزاز میں ضیافت کی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی غیر حاضری میں جو ضیافتیں ہوں گی اور جن میں وہ بدقسمتی سے شریک نہیں ہو سکیگا ان کی تلافی کر دی جائے۔ اس کی واپسی پر پھر ضیافتیں ہوتی ہیں۔ اور ان کا مقصد بھی بظاہر اس کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بہت سی ضیافتوں میں شریک نہیں ہو سکا۔ اس لئے اب ضیافت کر کے اس عدم شرکت کی تلافی کی جا رہی ہے۔

پرسوں ایک صاحب جو یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں مجھ سے ملنے آئے اور کہنے لگے۔ میں آپ کے اعزاز میں شہر کے معزز لوگوں کو مدعو کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا میں اس عزّت افزائی کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔

غور کرو تو انہوں نے بھی جھوٹ بولا۔ اور میں نے جھوٹ بولا۔ یہ

ضیافت میرے اعزاز میں ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ وہ مجھ سے محض اپنی فرم کے اشتہار کا کام لینا چاہتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں نہ تو میری عزت افزائی تھی۔ نہ میرے لئے ان کا ممنون ہونے کی کوئی وجہ تھی۔ لیکن یہاں کے رسم و رواج اور عام آداب اخلاق کا اقتضا یہی تھا۔ کہ جھوٹ کا جواب جھوٹ سے دیا جائے ورنہ وہ مجھے غیر مہذب سمجھتے۔ اور مجھ پر ہی نہیں بلکہ تمام اہل مریخ پر حرف آتا۔

کل سر شام میں ان کے ہاں جا پہنچا۔ ایک وسیع سبزہ زار میں شامیانے تنے تھے۔ قناتیں لگی تھیں۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ کچھ لوگ آ چکے تھے۔ کچھ آ رہے تھے۔ صاحبِ خانہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور سارے معزز مہمانوں سے میری ملاقات کرائی۔ میں نے یہاں اکثر دیکھا ہے۔ کہ ایک قلندر بندر کو ساتھ لئے گلی کوچوں میں پھرتا ہے۔ اُسے دیکھ کے بچے اور عورتیں مرد جمع ہو جاتے ہیں۔ بندر کرتب دکھاتا ہے۔ لوگ پیسہ پیسہ دیتے ہیں۔ اور قلندر اس طرح خاص رقم جمع کر لیتا ہے۔ جب میزبان مہمانوں سے میرا تعارف کرا رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں بندر ہوں اور میرا میزبان قلندر ہے۔ میزبان کہتا ہے۔ آپ زرنیخ صاحب ہیں۔ مریخ سے تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ان کا ذکر اخباروں میں پڑھا ہوگا اور آپ لالہ گوردھن داس ہیں۔ لوہے کے مشہور تاجر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لالہ جی کہتے ہیں۔ اچھا آپ زرنیخ صاحب ہیں۔ انہیں کون نہیں جانتا
ساری دنیا میں ان کی دھوم ہے۔ صاحب آپ سے ملاقات کا بڑا اشتیاق
تھا۔

میں سر کو خم کرتا ہوں اور ان سے مصافحہ کر کے کہتا ہوں آپ سے ملاقات
کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ جھوٹ بالکل جھوٹ لالہ گوردھن داس سے
ملاقات کر کے کسی شخص کو مسرت نہیں ہو سکتی۔ ان کی رنگت سیاہ ہے
چہرے پر جا بجا چیچک کے داغ توند بڑھی ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں آواز
بے حد کریہہ۔ لیکن اس جھوٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کھیل اور قلندر
اور بندر کے تماشے میں صرف یہ فرق ہے کہ میرے میزبان نے لالہ گوردھن داس
سے پیسہ نہیں مانگا لیکن مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ بچارے لالہ سے
ضرور دام وصول کر کے رہے گا اور نقد دام وصول نہ کئے تو کوئی نہ کوئی فائدہ
اٹھائے گا غرض اسی طرح قریب قریب دوسو آدمیوں سے جن میں عورتیں
بھی تھیں۔ مصافحہ کیا اور قریب قریب یہی الفاظ کہے۔ اس کے معنی یہ نہیں
کہ ان دوسو آدمیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا۔ جس سے مل کے مجھے
مسرت ہوئی ہو۔ کئی اشخاص ایسے تھے جن سے مل کے مجھے سچ مچ خوشی

ہوتی ہے۔ مثلاً ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں۔ لال
لال ہونٹ لمبے لمبے سیاہ بال۔ اس کے چہرے پر معصومیت برس رہی تھی
اور اس کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک تھی۔ میں نے جب اس سے کہا کہ
مجھے آپ سے مل کے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ تو اگرچہ میں نے یہ الفاظ سچے دل
سے کہے تھے۔ تاہم مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ یہی فقرہ میں ایسے لوگوں
سے کہہ چکا ہوں جن سے مل کے مجھے روحانی اذیت ہوئی۔ اس لئے اب
یہ الفاظ بالکل بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ضیافت کی حیثیت محض تجارتی تھی۔ جو لوگ
اس دعوت میں شریک تھے وہ سب کے سب ایسے تھے جن سے میرے
میزبان کو کسی نہ کسی نفع کی اُمید ہو سکتی تھی اس لئے شروع سے آخر تک
میری طبیعت مکدر رہی اور اگرچہ میں نے اپنی طبیعت کے تکدر کو چھپانے
کی بڑی کوشش کی لیکن افسوس ہے کہ مجھے اس معاملے میں چنداں کامیابی
نہیں ہوئی۔ اور اگرچہ جھوٹ کو بہت مفید چیز سمجھتا ہوں لیکن اس ضیافت
میں اس کثرت سے جھوٹ بولا گیا کہ میں گھبرا اُٹھا۔ مثلاً مجھ سے کچھ دور ہٹ
کے ایک عورت اور مرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یکایک انہیں ایک نیا مہمان

آتا دکھائی دیا۔ مرد کہنے لگا۔ یہ کمبخت یہاں بھی آئے گا۔ عورت بولی۔ یہ منحوس ہر جگہ موجود ہے۔

مرد بولا۔ اور اس کی بیوی۔

عورت کہنے لگی۔ وہ مردار اس سے بھی بدتر ہے۔

لیکن جب وہ شخص قریب آیا۔ تو یہ دونوں اٹھے۔ عورت آگے بڑھ کے کہنے لگی۔ خوب وقت پر آئے۔ ابھی ابھی آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اب تو آپ سے کئی ہفتوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔

نووارد بولا۔ کیا کہوں بہت مصروف ہوں۔

مرد کہنے لگا۔ لیکن ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آپ پرانے دوستوں کو بھول جائیں۔

یہ تو ایک مثال ہے اس محفل میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کی ہو۔ خیر صاحب خدا خدا کر کے کھانا آیا یہاں ضیافتوں میں اس قسم کا ثقیل کھانا میز پر آتا ہے۔ کہ کھانے والا مرے نہیں تو بیمار ضرور پڑ جائے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ضیافت کا مقصد لوگوں کا منہ بند کرنا یا اپنے مال تجارت کا اشتہار دینا ہی نہیں۔ بلکہ اس بہانے یہ لوگ ایک

دوسرے سے انتقام لینے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انتقام دانستہ لیا جاتا ہے۔ یا نادانستہ اغلب یہی ہے کہ نہ میزبان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتقام لے رہا ہے نہ مہمان جانتا ہے کہ اس سے انتقام لیا جارہا ہے۔ لیکن صرف یہی بات نہیں ضیافتوں پر لوگوں کو مدعو کرنے میں جو دوسرے مقاصد پوشیدہ ہیں۔ اُن سے بھی تو اکثر اوقات مہمان اور میزبان بے خبر ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ جس اطمینان سے کھانا کھاتے ہیں۔ اس سے بھی تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضیافت کی انتقامی حیثیت سے بے خبر ہیں۔ میں اہل زمین کی ذہانت کا اتنا معتقد تو نہیں۔ ہاں ان کے معدے کا ضرور معتقد ہوں بلکہ میں تو اب اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ جھوٹ کا معدے سے ضرور کوئی نہ کوئی تعلق ہے معدہ جتنا قوی ہو انسان اتنی ہی کامیابی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ ایک اور بات بھی کہہ دوں۔ ضیافتوں میں شریک ہونا میرے نزدیک ایک وحشیانہ حرکت ہے۔ یہ لوگ جس طرح کھانا کھاتے ہیں اس سے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ انہیں کمرے کے دروازے بند کر کے تنہائی میں کھانا چاہیئے دو سو آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہو کر کھانا کھانے کے کمالات دکھانا ایسی حرکت نہیں۔ جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکے

ہر طرف سے عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کوئی کھانس رہا ہے کوئی کھانا اس طرح چبا رہا ہے کہ دور دور تک آواز جاتی ہے۔ کوئی ہونٹ چاٹ رہا ہے۔ کوئی چٹخارے لے رہا ہے۔ کسی نے ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا ہے کوئی چھری کانٹے سے کشتی لڑنے میں مصروف ہے۔ میں نے تو یونہی اخلاق کے تقاضے سے منہ جھٹال لیا اور چپکا بیٹھا رہا ورنہ جی چاہتا تھا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں۔

ضیافت ختم ہوئی۔ لوگ رخصت ہونے لگے۔ پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ کا شکریہ آپنے بڑی زحمت فرمائی۔ کھانا بہت لذیذ تھا ساری عمر ایسا کھانا نہیں کھایا۔

" جھوٹ سب جھوٹ "

شاعروں اور ادیبوں کی ایک محفل

میرے دوست توبیخ ایک اور قصہ سنو۔ پرسوں ایک صاحب جن کے سر پہ پٹے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ سانولی رنگت۔ چھوٹا سا قد ننھے ننھے ہاتھ پاؤں تشریف لائے۔ آتے ہی جھک کے تسلیمات بجا لائے۔ اور پھر کہنے لگے۔ حضور کا اسم شریف زربیخ ہے۔ میں نے کہا جی ہاں فدوی کو زربیخ کہتے ہیں۔ کہنے لگے بندہ نواز غلام شاعر ہے۔ اور صمصام تخلص کرتا ہے۔ میں نے یہاں کی عام رسم کے مطابق کہا آپ کا نیاز حاصل کر کے بڑی مسرت ہوئی۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ فرمانے لگے اے حضرت یہاں کے ایک رئیس ہیں نواب چھمن ان کے یہاں گاہے ماہے ایک ادبی

محفل ہوتی ہے جس میں شہر بھر کے سارے ادیب اور شاعر جمع ہو کے اپنا اپنا کلام نظم و نثر سناتے ہیں۔ نواب صاحب کی دلی آرزو ہے کہ آپ بھی اس ادبی جلسے میں شرکت فرمائیں۔ میں نے کہا نواب صاحب کی ذرہ نوازی ہے کہ اس ہیچ میرز کو یاد فرمایا لیکن میں کہاں اور ادبی محفل کہاں۔ کہنے لگے یہ نہ فرمائیے۔ آپ نے زبان اردو میں چند دنوں کے اندر وہ سلیقہ بہم پہنچایا ہے کہ باید و شاید بلکہ حق تو یہ ہے کہ اہل مریخ کی زبان دانی کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ آپ سے بڑا سخن سنج و سخن فہم کون ہوگا۔ فدوی نے بھی اس محفل کے لئے کچھ لکھا ہے۔ کچھ نظم ہے کچھ نثر یہ کہہ کر انہوں نے بغل سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ جسے دیکھتے ہی میرے حواس غائب ہو گئے یہاں کے شاعروں میں یہ عجیب عادت ہے کہ جب تک اپنا کلام شہر بھر کو نہ سنائیں۔ انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے۔ افسانہ نگار دو گھنٹے میں اپنا افسانہ لکھتا ہے۔ اور دو سال اسے سناتا پھرتا ہے۔ پہلے بیوی بچوں اور رشتے داروں پر مشقِ ستم ہوتی ہے۔ پھر اہل محلہ اور احباب کی باری آتی ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ راستہ چلتوں کو افسانہ سنایا جا رہا ہے۔ چونکہ مجھے اس گروہ سے واسطہ

پڑھ چکا ہے۔ اس لئے جب صمصام صاحب نے بغل سے پلندہ۔ اور جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی۔ تو میں سمجھ گیا کہ بس شامت آئی۔ یہ حضرت اب اپنا کلام سنائیں گے۔ اور مجھ میں کلام سننے کی تاب ہو نہ ہو۔ جب تک ان میں سنانے کی تاب باقی ہے۔ برابر سناتے چلے جائیں گے۔ لیکن میری حاضر دماغی کی داد دو کہ جب میاں صمصام نے پان کی گلوری کلّے میں دبا کے عینک کو درست کر کے ناک بانسے پر رکھا اور سر کو عجیب انداز سے حرکت دے کر فرمایا کہ کچھ عرض کیا چاہتا ہوں۔ تو میں نے کہا ہم اہلِ مریخ کا قاعدہ نہیں۔ کہ پہلی ہی ملاقات میں شاعر سے اس کا کلام سننے بیٹھ جائیں۔ اسے ہمارے ہاں فن شعر کی توہین سمجھا جاتا ہے۔ اصل شعر سمجھنے کے لئے شاعر کی نفسیات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ جب تک ہمیں شاعر کے عادات و خصائل اور اس کی ذہنی کیفیت کا علم نہ ہو۔ ہم یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس کی کون کون سی دبی ہوئی خواہشوں اور آرزوؤں نے شعر کا قالب اختیار کر لیا ہے۔ وجہ معقول تھی۔ لیکن وہ کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے۔ ہاں ہوں کر کے رہ گئے۔ میں نے انہیں آزردہ دیکھ کر جھٹ کاغذ کا پلندہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا۔ سر پہ رکھا پھر کہا۔ حضرت کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے اس ذرۂ بے مقدار کو اپنا کلام

سنانے کے لئے منتخب فرمایا۔ لیکن اپنے ملک کے قاعدے سے مجبور ہوں ایسی گستاخی کیونکر کر سکتا ہوں یہ سنکر ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا کہنے لگے جلسے میں تو ضرور آئیے گا۔ میں نے کہا جی ہاں ضرور حاضر ہوں گا۔ غرض وہ یہ کہہ کر تشریف لے گئے۔ اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اتوار کو تیسرے پہر نواب چھمن کے یہاں پہنچا۔ میاں صمصام ساتھ تھے۔ راستے بھر سوچتا گیا کہ ادب و شعر کو جلسوں سے کیا سروکار۔ یہ تو پڑھنے اور غور کرنے کی چیزیں ہیں۔ ہم مریخ کے لوگوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہزاروں کوس کا حال دم بھر میں معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن ریڈیو میں ہمارے ہاں جو ترقیاں ہوئی ہیں انہوں نے اخباروں کو تو مٹا دیا۔ تاہم کتابیں بدستور باقی ہیں۔ ریڈیو پر یہ تو ممکن نہیں۔ کہ جو شعر سمجھ میں نہ آئے اُسے سنئے مکرر پڑھوا کے سنئے۔ پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو فرصت کے وقت پر اٹھا کے رکھئے۔ لیکن اہل زمین کا اس بارے میں عجب حال ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ ریڈیو اور فلم کی ایجاد نے ہمیں کتابوں سے بہت حد تک بے نیاز کر دیا۔ جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ نواب چھمن کے ادبی جلسوں نے پوری کر دی۔ جن چیزوں کو سمجھنے کے لئے دماغ پر زور نہ دینا پڑے ان کے لئے تو ریڈیو۔ فلم یا جلسے بے شک موزوں

ہیں۔ لیکن جہاں دماغ لڑانا ضروری ہے وہاں تو کتاب کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ ان لوگوں میں ریڈیو اور فلم وغیرہ کے متعلق جو خوش فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ کہیں اس کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ ان کے ذہن بالکل کند ہو کر رہ جائیں اور ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔

ان خیالوں میں غرق میں نواب چھمن کے دولت خانے پر پہنچا ڈیوڑھی پر ایک بڈھا دربان بیٹھا تھا جس کی بھنویں تک سپید تھیں۔ نواب صاحب ایک پرانی وضع کی محل سرا میں رہتے ہیں۔ جس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے۔ اس میں جگہ جگہ پرانی قسم کی صحن چیاں شہ نشینیں اور حجرے ہیں ہیروڈوٹس نے جو کتاب آثار لکھی ہے۔ اس میں پانچ ہزار برس پہلے کے تمدن پر ایک الگ باب ہے۔ جس میں کئی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو جائیگا کہ نواب چھمن کی محل سرائے کس وضع کی ہے۔ ایک وسیع صحن میں جہاں نواب صاحب کے بزرگوں کے وقت میں مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ بٹیر بن لڑائی جاتی رہی ہیں۔ ناچ اور گانے کی محفلیں برپا کی گئی ہیں۔ چاندنی کا فرش تھا۔ نواب صاحب مسند پر تشریف فرما تھے۔ اور اہلِ محفل حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ اگرچہ نواب چھمن عمر کے اعتبار سے ابھی نوجوان ہیں۔ لیکن وضع اور خیالات

کے لحاظ سے قدامت پسند ہیں۔ پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ ان کی محفل میں قدامت پسند بزرگوں کے ساتھ ساتھ جدید خیالات کے لوگ برابر موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب لوگ کھڑے ہو گئے اور نواب صاحب اس تپاک کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ گویا برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست سے ملاقات ہوئی پھر تکلفات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے اپنے ساتھ مجھے مقام صدر پر بٹھانا چاہا میں نے عذر کیا انہوں نے اصرار فرمایا اور مجھے مجبوراً ان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ تھوڑی دیر تک تو یہ کیفیت رہی کہ وہ میری تعریف کر رہے ہیں۔ اور میں اپنی مذمت کر رہا ہوں۔ جب وہ میری مدح کرتے اور میں اپنے آپ کو گالیاں دینے سے فارغ ہو چکا۔ تو جلسہ شروع ہوا۔ پہلے ایک صاحب نے جن کا نام فغاں ہے ایک غزل سنائی۔

فغاں صاحب خاص عمر کے آدمی ہیں۔ ڈاڑھی سپید ہو چکی ہے۔ گندمی رنگت قد میانہ۔ چست پاجامہ کالی اچکن۔ آواز جوانی میں کراری ہو گی۔ لیکن اب دانت گر گئے ہیں۔ جب پوپلے منہ سے شعر پڑھتے ہیں تو معنی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پہلے شعر میں ہجر کی کالی رات کا ذکر تھا۔ دوسرے میں مضمون یہ تھا کہ شاعر

محبوب کی محفل میں بیٹھا تھا۔ لیکن وہاں سے اسے دھکے دے کر نکال دیا گیا اس پر واہ واہ سبحان اللہ کا غلغلہ بلند ہوا۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس موقعہ پر تحسین و آفرین کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو رونے کا مقام تھا اور اس بڈھے کو کیا ہو گیا۔ کہ مجمع عام میں اپنی رسوائی کا قصہ لے بیٹھا۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسا تمہارے والد بزرگوار کہیں کہ مجھے ترمید کی مشہور حسینہ آفریدہ سے عشق ہو گیا ہے لیکن اس کم بخت نے مجھے اپنے گھر سے دھکے دے کے باہر نکال دیا۔ اور ہم تم سب اس کارِ نمایاں پر داد دیں۔ میں نے تمہارے والد بزرگوار کا ذکر اس لئے کیا ہے۔ کہ فغاں صاحب کے فرزند ارجمند بھی اس محفل میں موجود تھے۔ اور باپ کو سب سے زیادہ داد دے رہے تھے۔

فغاں صاحب نے اسی قسم کے کئی شعر پڑھے لیکن ہر بار پھر پھر کے ان کی نظر مجھ پر جم جاتی تھی۔ میں نے سوچا میں اس موقعہ پر کیوں پیچھے رہوں۔ چنانچہ ایک شعر پر جس میں انہوں نے بہار کے موسم کا ذکر کیا تھا۔ میں نے بھی آہستہ سے سبحان اللہ کہہ دیا فغاں صاحب اس پر جھک کر آداب بجا لائے۔ میں نے بھی آداب کا جواب تسلیمات سے دینا مناسب سمجھا۔ فغاں صاحب نے جو تکلفات کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کہ مجھ سے ہار

مان جاتے۔ انہوں نے آداب کا تار باندھ دیا۔ خدا جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا۔ کہ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ٹھان لی۔ چنانچہ ادھر میں جھک جھک کر آداب بجا لا رہا ہوں اُدھر وہ بچھے جا رہے ہیں۔ آخر مجھی کو ہار ماننی پڑی اور میدان شاعر کے ہاتھ رہا۔

اس مختصر خط میں یہ کیونکہ بتاؤں کہ اس محفل میں میں نے کیا کیا سنا ایک صاحب نے کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی اور اگرچہ میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا کہ انہوں نے کیا کہا۔ تاہم اہلِ محفل نے داد دینے میں کمی نہیں کی بعد میں معلوم ہوا کہ گھوڑا ہسپتال میں سلوتری ہیں گھوڑوں کی نفسیات سمجھنے میں عمر صرف کر دی ہے اور اس فن میں جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس سے تنقیدِ شعر میں کام لے رہے ہیں ایک نوجوان شاعر نے جو جدید شعرا کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک نظم پڑھ کے سنائی اس نظم کو سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک شعرا کے نفسیاتی مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کا طبی معائنہ نہ کرا لیا جائے اُن کا کلام سمجھنے کی کوشش بے سود ہے۔ اور ان شاعر صاحب کا کلام تو ایسا دقیق اور بعید از فہم ہے کہ طبی معائنہ اور نفسیاتی مطالعہ کے باوجود شاید ان کے افکار عالیہ پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں۔ بہر حال نواب چھمن اس معاملے میں داد کے مستحق ہیں کہ ابتدا سے آخر تک لمحہ بھر کے لئے چپکے

نہیں بیٹھے۔ ہر فقرے پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا۔ ہر شعر پر ایک آدھ فقرہ ضرور ارشاد فرمایا ان کی عادت ہے کہ فقرے کے ساتھ ایک زور کا قہقہہ لگاتے اور پھر اس طرح داد طلب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ لوگ داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب باقی شاعر اور ادیب اپنے اپنے مضامین سنا چکے تو نواب صاحب کی باری آئی۔ اُن کے مضمون کا عنوان یاد نہیں رہا۔ لیکن اپنے شہر کی گلیوں کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ عنوان سے معلوم ہوتا تھا کہ مضمون لکھنے والا یا تو وارو غہ صفائی ہے۔ ورنہ معمار تو ضرور ہے لیکن مضمون میں گلیوں کے بجائے شہر کے کبابیوں کہاروں درزیوں۔ لنگڑ بزدل بنواڑیوں کا ذکر تھا۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہر کبابی ہر بنواڑی کا شجرۂ نسب موجود مثلاً سلار و کبابی کے والد میاں مداری اور اُن کے دادا میاں ہزاری کے مناقب ختم ہوئے۔ تو چھجو بنواڑی کے خاندان کا تذکرہ شروع ہوا جو اُن کے پردادا بدھو میاں کے کارناموں پر ختم ہو گیا۔ نواب صاحب میں کمال یہ ہے کہ لفظوں کے ساتھ کھیلتے ہیں یعنی انہیں بڑھاتے جھٹاتے الٹتے پلٹتے۔ جھنجھوڑتے توڑتے موڑتے لٹاتے بٹھاتے دوڑاتے اچھالتے اور بال کی کھال نکالتے ہیں اور یہی اُن کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اور داد کا وہ ہنگامہ کہ خدا کی پناہ۔ ہر شخص داد دینے میں

ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہا ہے خصوصاً جب انہوں نے کبابیوں کے خاندان کا ذکر چھیڑا تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ صاحبو مرحوم شیخ مداری اگرچہ کہنے کو کبابی تھے۔ لیکن کبابی کیا تھے گلقند آفتابی تھے۔ ہندوستان سے روم تک کمال کی دھوم تھی۔ شاہ روم نے سفیر خاص لینے کو بھیجا لیکن انکار کر دیا۔ میاں سلارو اپنے باکمال باپ کو نہیں پہنچے تھے۔ خیر ادرک کا لچھا خوب کترتے تھے۔ اور صاحبو میاں ہزاری کا کیا کہنا ہے مشہور شہر و دیار یگانۂ روزگار۔ مشہور ہے کہ چار گھڑی سے زیادہ دوکان پر نہیں بیٹھتے تھے۔ پھر بھی ان کے ہاں مجمع خاص و عام رہتا تھا۔ جب سے ان بزرگوں نے خلا کو اپنا مسکن بنایا ہے۔ اپنا اپنا نہیں پرایا ہے شہر سونا نظر آتا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ صاحبو! ——"

اور تو یہ سچ پوچھو تو خود مجھ پہ بھی رقت طاری ہو ئی جاتی ہے اس لئے بالفعل قلم کو فرصت دیتا ہوں۔ یعنی خط کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

یونیورسٹی میں ایک دن

تو بیخ یہ کیا بات ہے کہ نہ سلام نہ کلام نہ خط نہ پیغام۔ میں اس سیاہ خانے میں جسے لوگ کرۂ ارض کہتے ہیں۔ تمہاری یاد کے سہارے جیتا ہوں اور تم ہو کہ مجھے لائق خطاب ہی نہیں سمجھتے۔

میری زندگی کا وہی ہنجار ہے۔ یعنی لمحہ بھر کے لئے سکون میسر نہیں کبھی دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ کبھی رقص و سرود کی محفلیں۔ میلے ٹھیلے جلسے تقریریں بحثیں۔ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ شہر کے رئیس زادے ہیں۔ وہ سیٹھ ہیں۔ یہ شاعر ہیں۔ وہ ادیب ہیں۔ یہ اخبار نویس ہیں۔ وہ وکیل ہیں۔ غرض کہ چند دنوں میں طرح طرح کے آدمیوں سے مل چکا ہوں۔

ابتدا ابتدا میں اچھی خاص وحشت ہوتی تھی۔ ان کے طور طریقے نشست و برخاست کے تکلفات۔ ادب آداب قاعدے اور دستور ایسے انوکھے اور بے ہنگم سے معلوم ہوتے تھے کہ بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن اب میں ان کے طور طریقے کی ایسی نقل اتارتا ہوں۔ کہ یہاں کے اچھے اچھے وضعدار لوگ چکّر میں ہیں۔ وہی جھک جھک کر سلام کرنا۔ بات بات پر آداب بجا لانا۔ ذرا ذرا سی توجہ پر شکریہ ہر فقرے پر قہقہہ ادھر تعریف ہوتی ہے۔ ادھر انکسار میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اِدھر تحسین کی جاتی ہے۔ اُدھر انکسار سے جواب دیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ اے سبحان اللہ کیا خوب۔ کیا نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ حضور کی ذرہ نوازی ہے ورنہ اس ہیچ میرز ذرۂ بے مقدار کا کیا مقدور ہے۔ غرض ہر ملاقات کا یہ انداز ہے۔ گویا دو حریف آمنے سامنے ہیں۔ ایک وار کرتا ہے۔ دوسرا رد کرتا ہے۔ لیکن حملے اور حملے سے بچنے کے قاعدے مقرر ہیں۔ ایک دائرہ ہے جس میں لوگ گردش کئے جاتے ہیں۔

یہ باتیں ذہن میں رکھو۔ تو یہ سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ یہاں علم و دانش کا کیا انداز ہے۔ ان لوگوں کی یونیورسٹیاں اور دانش گاہیں مکتب اور مدرسے

کس قسم کے ہیں۔ مجھے یہاں کی سب سے بڑی دانش گاہ میں پورا دن گزارنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متحیر کیا۔ وہ اس دانش گاہ کی عمارت ہے عمارت تو خاصی بڑی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر نہ شفقت کا گداز ہے نہ محبت کا نور۔ اس کی آنکھوں سے غرور ٹپک رہا ہے اور ماتھے پر بل پڑے ہیں۔ اسے دیکھنے سے نہ تو آنکھوں کو لذت ملتی ہے۔ نہ قلب و دماغ کو آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ ہاں دل پہ ہیبت ضرور طاری ہوتی ہے۔ اہلِ زمین کے نزدیک علم کا تصور یہ ہے کہ وہ ایک مہیب چیز ہے۔ جس کے چہرے سے خشونت کے ساتھ ساتھ قدامت اور فرسودگی کے آثار ہویدا ہیں۔ اس لئے یونیورسٹی کی عمارت کے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ وہ ظاہری حُسن سے قطعاً محروم ہو۔ اور اُسے دیکھتے ہی انسان کا سر علم کی عظمت اور ہیبت کے سامنے جھک جائے۔ گویا علم کوئی ایسی چیز نہیں جس سے محبت کی جا سکے۔ اس سے تو صرف ڈرنا چاہیے۔ وہ بلا شور کے خوفناک نہنگوں کی مانند ہے۔ جو نشواط کی تاریک وادیوں میں لیٹے رہتے ہیں .... تم سمجھتے ہو کہ اس وحشت ناک عمارت کو دیکھ کے جس کے در و دیوار پہ اداسی برس رہی ہے مجھے کتنی کوفت ہوئی ہو گی پہلے تو میرے جی میں آئی تھی کہ یہیں سے واپس چلا جاؤں۔ لیکن تجسّس کے شوق نے دامن

تھام لیا۔

میں یونیورسٹی کے سب سے بڑے عہدہ دار سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن تک سے ملا ہوں اور وہ سب مجھ سے بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان سب لوگوں کے دلوں پر کوئی بڑا بوجھ ہے۔ کوئی پراسرار غم انہیں اندر ہی اندر گھلائے ڈالتا ہے۔

کیا علم کا بوجھ ہے۔ کیا وہ کوئی دکھ ہے۔ پھر اس افسردگی اور اداسی کے کیا معنی۔ ان لوگوں کے ہونٹ مسکراہٹ سے کیوں محروم ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک معنی غم کیوں جھلک رہا ہے۔ جو پروفیسر صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ تو وہ کہنے لگے جسے آپ افسردگی سمجھ رہے ہیں۔ وہ سنجیدگی ہے۔ اور علم لازمی طور پہ انسان میں سنجیدگی اور متانت پیدا کر دیتا ہے۔ میں نے کہا آپ کی مراد رعونت سے ہے۔ کہنے لگے نہیں اسے رعونت نہ کہئے۔ علم کا وقار کہئے۔ میں نے کہا علم تو نشاط و سرور اور کیف و استہزا کا نام ہے۔ وہ کہنے لگے آپ کی مراد عشق سے ہے۔

میں نے کہا آپ لوگ عشق کو صرف عورت تک کیوں محدود کر دیتے ہیں۔ علم کا عشق بھی تو ہو سکتا ہے۔

کہنے لگے کہ ہاں ہو تو سکتا ہے۔

میں نے کہا اور سنئے۔ جس چیز کو آپ عشق کہتے ہیں۔ وہ بھی تو ایک حیثیت سے علم کی تشنگی ہے۔ کہنے لگے وہ کیسے۔ میں نے کہا عورت ایک پُر اسرار مخلوق ہے۔ قدرت کا ایک سرِ مخفی۔ محض اس بھید کی ٹوہ لگانے کے لئے مرد کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے۔

فرمایا میں تو لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔ عورت اور مرد کے معاملات اور عشق و محبت کے اسرار کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

میں نے کہا اچھا اسے جانے دیجئے۔ لیکن یہ تو بتائیے علم کے عشق نے آپ لوگوں میں یہ افسردگی اور اضمحلال کیوں پیدا کر دیا ہے۔

فرمانے لگے علم کا عشق کس مردود کو ہے۔ مجھے تو محض معاش نے معلمی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ والد مرحوم زندہ ہوتے۔ تو میں آج کہیں تھانیدار ہوتا۔

میں نے کہا۔ اور یہ سب لوگ۔ یہ آپ کے بڑے بڑے پروفیسر اور اربابِ علم۔

کہنے لگے۔ ان میں سے بھی اکثر کا یہی حال ہے۔ یعنی معاش کی وجہ سے معلمی پر مجبور ہیں۔ اور پیشوں میں گنجائش کم ہے۔ اس پیشے میں پھر بھی جگہ نکل آتی ہے

میں نے کہا۔ اب سمجھا تو یوں کہیے کہ علم و دانش کا صرف نام ہی نام ہے

یہ سب کما کھانے کے ڈھنگ ہیں۔

کہنے لگے۔صاحب! آپ ہم اہلِ زمین کے معاملات کو ابھی نہیں سمجھتے یہاں معاش کا مسئلہ سب سے مقدم ہے۔عشق و محبّت فراغت کی باتیں ہیں بچا ہے عشق علم کا ہو چاہے عورت کا۔

میں نے کہا۔اچھا استادوں کو جانے دیجئے۔طلبہ کو لیجئے۔

کہنے لگے۔آپ طلبہ کو بھی دیکھ چکے۔

میں نے کہا۔دیکھا تو ضرور ہے۔لیکن پروفیسروں میں اکثر کے سر کے بال اُڑ گئے ہیں۔آنکھوں پر عینک ہے۔طلبہ میں گنجے تو کم ہیں۔لیکن اکثر چشمہ لگاتے ہیں۔

کہنے لگے۔طلب علم کی راہ میں کچھ نہ کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے۔کتابیں پڑھیں گے تو بینائی میں ضرور فرق آئے گا۔

میں نے کہا: تو یوں کہیئے کہ علم صرف بڑی بڑی کتابوں میں دبا پڑا ہے۔

فرمایا۔علم کتابوں میں نہیں تو اور کہاں ہے۔

میں نے پوچھا۔کبھی آپنے کائنات کو بھی نظر اٹھا کر دیکھا ہے۔

کہنے لگے۔ہم سے پہلے جو اہل علم گذرے ہیں۔کیا ان کے تجربوں سے

فایدہ نہ اٹھایا جائے۔ میں نے کہا ضرور فایدہ اٹھائیے۔ لیکن طلبہ کو خود بھی تو کچھ دیکھنے۔ سوچنے اور غور کرنے کا موقع دیجئے۔

کہنے لگے۔ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے۔ جو طالب علم محنت کرتے ہیں۔ وہ سب کچھ حاصل کرتے ہیں۔ میں نے کہا یہ کہئے کہ تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کے کتابیں رٹ لیتے ہیں اور صحت کھو بیٹھتے ہیں۔ پوچھنے لگے مریخ میں تعلیم کا کیا طریقہ ہے؟

میں نے کہا۔ وہاں تو یہ قاعدہ ہے۔ کہ طالب علم اور استاد ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں۔ اور سفر میں ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے چھ سال تعلیم پائی ہے ان چھ برسوں میں چار سال مسلسل سفر میں رہا ہوں باقی دو سال چار بڑے بڑے علمی مرکزوں میں گزارے ہیں۔ ہر علمی مرکز میں چھ چھ مہینے رہا ہوں۔

انہوں نے پوچھا۔ سفر میں کیسے تعلیم ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔ چار طلبہ پہ ایک استاد مقرر ہوتا ہے۔ جو انہیں مریخ کے مختلف حصوں کی سیر کراتا ہے۔ مثلاً میں پورے مریخ کا چکر لگا چکا ہوں۔ ایک ایک شہر کی سیر کی ہے۔ ہر علاقے کے لوگوں سے ملا ہوں۔ وہاں کی تاریخ جغرافیہ علم و فن، صنعت و حرفت کا مطالعہ کیا ہے۔

کہنے لگے آپ کے یہاں تعلیم کا مقصد کیا سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا صحیح قسم کی زندگی بسر کرنا۔ اور آپ کے ہاں؟

ٹھنڈی سانس بھر کے کہنے لگے۔ روٹی کمانا۔

میں نے کہا۔ جب تو بڑا فرق ہے لیکن یہ تو بتائیے کہ اگر آپ کے ہاں روٹی کمانا تعلیم کا بڑا مقصد ہے تو آپ کے نصاب تعلیم میں ادب، شاعری کی کتابیں کیوں شامل ہیں۔ ان سے روٹی کمانے میں تو کوئی مدد نہیں ملتی۔

کہنے لگے ہماری تعلیم کا مقصد تو روٹی کمانا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر روٹی کمانے کے قابل بھی نہیں رہتے۔

میں نے پوچھا۔ اس کی وجہ؟

کہنے لگے یہ مریخ نہیں زمین ہے اور زمین کا بھی وہ گوشہ ہے جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ اس کی وجہ خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ آپ کو کیا بتاؤں؟

یونیورسٹی میں قریب قریب سب پروفیسروں سے ملا ہوں اور بعض سے گفتگو بھی ہوئی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ بزرگ علم ہیئت کے پروفیسر صاحب تھے۔ جب میرے ہمراہی نے ان سے میرا تعارف کرایا تو کہنے لگے۔ آپ مریخ سے آئے ہیں؟

میں نے کہا۔ جی ہاں۔ کہنے لگے مجھے تو یقین نہیں آتا۔ میں نے کہا۔ کیوں یقین نہیں آتا۔ فرمایا علمائے ہیئت کی رائے یہ ہے کہ مریخ میں آبادی ہی نہیں
میں نے کہا۔ آپ کے علمائے ہیئت کی رائے میری شہادت کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے۔

وہ چلا کے کہنے لگے: آپ اہل علم کی توہین کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ آپ علم کی توہین کر رہے ہیں۔

فرمایا۔ وہ کیسے ؟

میں نے کہا۔ آپ ظن وقیاس کو علم ویقین پر ترجیح دے رہے ہیں۔

کہنے لگے میں نے اس مسئلہ پہ ایک ہزار کتابیں پڑھی ہیں۔

میں نے عرض کیا۔ میں خود مریخ سے آیا ہوں۔

کہنے لگے میں نہیں مانتا۔ کہ مریخ میں آبادی ہے۔

میں نے کہا۔ نہ مانیئے۔ کسی شخص کے ماننے یا نہ ماننے سے مسلمات باطل نہیں ہو جاتے۔ اتنی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور یہ خطرہ ہو چلا کہ کہیں ان پروفیسر کے معتقد مجھے پیٹ ہی نہ ڈالیں۔۔۔۔۔۔۔۔
اس لئے میں نے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا لیکن دور تک میرے

کانوں میں یہ آواز آتی رہی۔ ہزار کتابیں۔ علم ہیئت کی ہزار کتابیں۔

اسمبلی میں

تو یخ بین نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب چند دنوں سے زیادہ یہاں نہیں رہوں گا
ترا مید کی وادیوں شنگاریکے چمن زاروں ہندوستان کے تاکستانوں اور کوہ اجود کے
لالہ زاروں کی یاد اس طرح دل میں چٹکیاں لے رہی ہے کہ بس جی چاہتا ہے مہینوں
کی مسافت چند لمحوں میں طے کر لوں۔ اور یوں اچانک دریلے نو کے کنارے
جا اتروں کہ سب حیران رہ جائیں۔ اور تم سے کیا پردہ ہے۔ زندگی کا یہی انداز
رہا تو ڈر ہے کہ کہیں یہیں کا ہو کے نہ رہ جاؤں۔ زمین ہو یا مریخ حسن کا دام بلا
ہر جگہ پھیلا ہوتا ہے۔ اور عشق کا کماندار ہر جگہ دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ معاف
کنایہ اہلِ زمین کا انداز گفتگو ہے۔ عشق ان لوگوں کے نزدیک تیر انداز ہے۔ جسے

دل چھیدنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ اور یہ بات صحیح بھی ہے۔ کون ہے جو اس کی ناوک افگن سے محفوظ ہے۔

بہرحال عشق کی کمانداری اور حسن کی کمند اندازی کی داستان کو جانے دو۔ اور یہ سنو کہ پچھلے دنوں میں نے لیجسلیٹو اسمبلی کی سیر دیکھی۔ ممبروں کی تقریریں سنیں۔ ان کی نوک جھونک بحثا بحثی حجت و تکرار کا لطف اٹھایا۔ اور اپنی آنکھوں سے قانون بنتے دیکھا۔ میاں سلیمان یہاں کے ایک اخبار نویس ہیں۔ اور جب سے میں یہاں آیا ہوں۔ اُن سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ چند دن ہوئے۔ وہ مجھ سے ملنے آئے اور پوچھنے لگے۔ آپ نے لیجسلیٹو اسمبلی تو نہیں دیکھی۔ میں نے کہا وہ کیا ہوتی ہے؟

کہنے لگے۔ یہاں کی قانون ساز مجلس۔

میں نے کہا۔ قانون ساز مجلس۔ تو کیا قانون بھی بنایا جا سکتا ہے۔

وہ بولے۔ قانون کیوں نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کیا دل کو کسی کل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ عشق سازی کا کارخانہ کھولا جا سکتا ہے۔ کہنے لگے۔ یہ تو ممکن نہیں۔ میں نے کہا۔ تو قانون سازی کیسے ممکن ہے۔ فرمایا کیا آپ کے ہاں کوئی قانون نہیں۔ میں نے عرض کیا قانون

تو ضرور ہے۔ لیکن بنایا نہیں جاتا۔ بولے ہمارے یہاں تو قانون بنایا جاتا ہے
میں نے کہا۔ جب تو قانون سازی کا یہ کارخانہ دیکھنے کی چیز ہے۔ یہ اور بات ہے
کہ میرے بعض لطیف احساسات کو ضرور صدمہ پہنچے گا۔ کہنے لگے اسے کارخانہ
تو نہ کہئے۔ ہمارے ہاں قانون بنانے کے لئے ایک مجلس قائم ہے۔ جس میں ملک
بھر کے مختلف علاقوں کے نمائندے شریک ہیں۔ یہ سب مل کے قانون بناتے
ہیں۔ میں نے کہا جب بھی اسے کارخانہ ہی کہنا چاہیے۔ عام کارخانوں میں لوہے
کی کلیں ہوتی ہیں۔ آپ کی قانون ساز مجلس میں انسان کل پرزوں کا کام دیتے
ہیں۔ کہنے لگے۔ پہلے چل کے اُسے دیکھ تو لیجئے۔ پھر رائے بھی قائم کر لیجئے گا۔

میں نے کہا۔ بہت اچھا یوں ہی سہی۔

دوسرے دن ہم نے اسمبلی کے اجلاس کا قصد کیا۔ راستے میں سلیمان صاحب
پوچھنے لگے کیا آپ کے ہاں قانون نہیں بنایا جاتا۔ میں نے کہا۔ نہیں تو ——
کہنے لگے پھر پیڑ کی طرح زمین سے اُگتا ہوگا۔ میں نے کہا۔ یہ بھی غلط۔ فرمایا پھر
یہ معمہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا پہلے یہ بتائیے۔ آپ کے نزدیک
قانون کا منشا کیا ہے۔ کہنے لگے زندگی میں ضبط و نظم پیدا کرنا۔ میں نے کہا۔
صرف ضبط و نظم۔ فرمایا ضبط و نظم بڑے جامع الفاظ ہیں۔ لیکن آپ وضاحت

چاہتے ہیں۔ تو میں کہوں گا۔ کہ قانون انسانوں کے حقوق و فرائض کی تعین کر دیتا ہے۔ تاکہ کوئی شخص اپنی حدود سے قدم باہر نہ نکالے۔ میں نے کہا آپ صبح اٹھتے ہیں۔ غسل کر کے چائے پیتے ہیں۔ پھر دفتر چلے جاتے ہیں۔ دن بھر وہاں رہتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتے ہیں چار گھڑی دن رہے گھر آتے ہیں۔ دوستوں سے گپ لڑاتے ہیں۔ کچھ وقت اہل و عیال میں گزر جاتا ہے۔ پھر رات کو کھانا کھا کر سو جاتے ہیں۔ کیا آپ کے ان مشاغل کی تعین قانون نے کر دی ہے۔ کہنے لگے نہیں۔ میں نے کہا۔ وہ کیوں۔ کہنے لگے۔ قانون کو اس سے کیا تعلق ؟

میں نے کہا۔ آپ نے فرمایا تھا۔ کہ قانون کا مقصد زندگی میں ضبط و نظم پیدا کرنا اور انسان کے حقوق و فرائض کی تعین کر دینا ہے۔ کیا آپ کے صبح اٹھنے کھانے پینے پہننے دفتر میں کام کرنے چلنے پھرنے جاگنے سونے پر ضبط و نظم اور حقوق و فرائض کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بولے قانون صرف ایسے موقعوں پر دخل دیتا ہے جہاں دوسرے انسانوں سے تصادم کا اندیشہ ہو یا ہم دوسرں کے حقوق کو غصب کرنے کی کوشش کریں۔ میں نے کہا کیا ساری رات جاگتے رہنا قانوناً جرم نہیں کہنے لگے۔ ہرگز نہیں۔ میں نے کہا اور خودکشی

کی کوشش کرنا۔ فرمایا وہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ میں نے کہا جب تو شب بیداری کو بھی جرم قرار دینا چاہیے۔ کہنے لگے کیوں۔ میں نے کہا اس لئے کہ شب بیداری بھی ایک حیثیت سے خودکشی کی کوشش ہے۔ آپ راتوں کو جاگتے رہیں گے۔ تو مختلف امراض میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور جلد مر جائیں گے کہنے لگے یہ کہئے۔ آپ قانون کے قائل ہی نہیں۔ میں نے کہا اوّل تو میرا قائل ہونا یا نہ ہونا خارج از بحث ہے کیونکہ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قانون کے متعلق اہلِ مریخ کا زاویہ نگاہ کیا ہے۔ دوسرے میں نے قانون کی افادیت سے انکار نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ قانون بنایا نہیں جا سکتا۔ وہ بولے لیجئے اسمبلی آگئی۔ آپ ابھی ابھی قانون بنتے دیکھ لیجئے گا۔ سلیمان اور میں دونوں گیلری میں جا بیٹھے۔ نیچے اسمبلی کا ہال تھا۔ اور اس میں ملک کے نمائندوں کا ہجوم۔ میاں سلیمان بولے اس اجتماع میں ہمارے ملک کے اکثر بڑے بڑے لوگ موجود ہیں۔ یہ بھاری بھرکم سے آدمی جن کے ہاتھ میں عینک ہے۔ تعلیمات کے شعبے کے انچارج ہیں۔ ان سے ہٹ کر ہمارے وزیر رسل و رسایل بیٹھے ہیں۔ دیکھا آپ نے کیا جامہ زیب آدمی ہیں۔ اور یہ صاحب جو —— میں نے کہا پہلے آپ یہ بتلائیے کہ آج یہاں کیا معاملہ درپیش ہے۔ کہنے لگے ایک سرکاری

ممبر نے ریلوے کے متعلق ایک نئے قانون کا مسودہ پیش کیا ہے۔ مسودہ کا مفہوم یہ ہے کہ ـــــ میں نے کہا۔ اِسے جانے دیجئے۔ آپ کے ہاں کے قانون ہی میری سمجھ میں نہیں آتے۔ اس قسم کی باتیں کیونکر سمجھ میں آئیں گی۔ سلیمان صاحب بولے۔ اب اس مسودہ پر بحث ہوگی۔ مخالف اور موافق فریق اپنی اپنی رائے دیں گے۔ اگر زیادہ رائیں اس کے حق میں ہوئیں تو وہ قانون کی حیثیت حاصل کرے گا۔ میں نے کہا بس قانون بنانا اتنا آسان ہے کہنے لگے نہیں صاحب۔ ابھی تو اس مسودہ کو کئی مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ لیجئے مخالف پارٹی کا لیڈر تقریر کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ بلا کا جادو بیاں آدمی ہے۔ تقریر کے زور سے دلوں کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے کہا تو یہاں دو پارٹیاں ہیں۔ سلیمان صاحب بولے یوں تو کئی پارٹیاں ہیں۔ لیکن بڑی بڑی پارٹیاں صرف دو ہیں۔ میں نے کہا کیا قانون آپ کے نزدیک مفید ہے۔ جواب ملا۔ میں اسے مفید سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا۔ اور اسمبلی کے ممبر۔ کہنے لگے بعض اسے مفید سمجھتے ہیں اور بعض غیر مفید۔ میں نے کہا ان لوگوں میں یہ اختلاف کیوں ہے۔ سلیمان صاحب بولے۔ اب آپ کو یہ باتیں کون سمجھائے۔ پہلے مجھے یہ تقریر سن لینے دیجئے۔ اور دیکھئے بات ذرا آہستہ کیجئے۔ نہیں تو یہاں

سے نکلنا پڑے گا۔

مخالف پارٹی کے لیڈر نے بڑے زور سے تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں بعض ممبروں نے اسے ٹوکا بھی آپس میں نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ قہقہے بھی لگے۔ تالیوں کا شور بھی مچا۔ میری سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہ آیا۔ پھر بھی یہ منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ دو لشکر میدان میں اترے ہیں۔ زبان کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی ہے۔ پھبتیوں کے تیر چلتے ہیں۔ لطیفوں کی گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ قہقہوں کے بم پھٹ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو قانون بنانا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے اچھی خاصی جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ اسمبلی کا اجلاس لنچ یعنی دوپہر کے کھانے کے لئے ملتوی ہوا۔ تو میں نے سلیمان سے پوچھا۔ قانون بن گیا۔ وہ بولے ابھی کہاں، ابھی تو یہ بحث خدا جانے کب تک چلے۔ لیکن ندیم صاحب ذرا خدا لگتی کہئے۔ آپ کو یہ طریقہ پسند آیا۔ میں نے کہا۔ پہلے ایک بات بتا دیجئے۔ اس طرح جو قانون بنتے ہیں۔ کیا سب لوگ ان کی پابندی کرتے ہیں۔ کہنے لگے نہیں کچھ لوگ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور انہیں سزائیں دی جاتی ہیں۔ میں نے کہا تو یوں کہئے کہ آپ کے یہاں قانون صرف توڑنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

قانون شکنی اور قانون سازی دونوں مشغلے ہیں۔ جن سے زندگی میں خاصی ہماہمی اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اصل میں آپ لوگ مروجہ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے نئے نئے راستے تلاش کر لیتے ہیں۔ اس لئے آئے دن قوانین میں ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں اور قانون کے ساتھ زندگی اور زندگی کے ساتھ ساتھ قانون پیچیدہ تر ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ہم اہلِ مریخ کا عمل چند پرانے اصولوں اور قاعدوں پر ہے۔ جو ان گنت صدیوں سے جوں کے توں چلے آتے ہیں۔ وہ ہمارے رگ و ریشے میں اس طرح سما گئے ہیں۔ کہ کوئی شخص ان سے ذرہ بھر اِدھر اُدھر نہیں ہوتا بلکہ اکثر اہلِ مریخ تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان اصولوں کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے۔ سلیمان نے کہا۔ لیکن زندگی کی ضرورتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے انہیں پورا کرنے کے لئے نئے نئے قوانین بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں نے کہا۔ یہ سورج لاکھوں کروڑوں برس سے آپ پر چمک رہا ہے۔ یہ آسمان یہ چاند ستارے یہ پہاڑ یہ سمندر۔ نہ جانے کب سے ہیں۔ اور کب تک رہیں گے۔ رات کے بعد دن آتا ہے۔ دن کے بعد رات۔ گرمی کے بعد سردی ہے اور سردی کے بعد گرمی۔ کیا آپ کو کبھی خیال نہیں آیا۔ کہ

ان میں بھی کسی تغیر کی ضرورت ہے۔ اصل میں آپ کے قانون اور آپ کے اصول اور قاعدے بجلی کے قمقموں کے مانند ناپائیدار ہیں جن کی روشنی ایک مختصر دائرے سے باہر نہیں نکلتی اور ہمارے جن قاعدوں اور اصولوں پر ہمارا عمل ہے وہ آفتاب کی طرح درخشندہ ہیں۔ پہاڑوں کی طرح محکم و پائندہ اور سمندر کی طرح وسیع و بیکراں۔ سلیمان نے پوچھا کیا آپ کے ہاں کوئی شخص چوری نہیں کرتا۔ میں نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی برائی موجود نہیں۔ سلیمان نے کہا اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا۔ جو راستہ ہم نے اپنے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ اس پر قدم مارتے چلے جانا ہماری طبیعتوں میں راسخ ہو چکا ہے۔ آپ نے دیکھا۔ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ دریا اپنے مقررہ راستے پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ میاں سلیمان کہنے لگے۔ کبھی کبھی دریا اپنا راستہ بھی تو تبدیل کرتے ہیں۔ ان میں سیلاب بھی تو آتے ہیں۔ ان کا پانی کناروں سے گزر کے آس پاس کی سرزمین کو اپنے آغوش میں تو لے لیتا ہے۔ میں نے کہا۔ لیکن ایسا شاذ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب کوئی شخص مقررہ دائرے سے انحراف کرتا ہے تو اسے بہت بڑا حادثہ سمجھا جاتا ہے۔

میاں سلیمان تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر چلے گئے۔ اور میں اپنی قیامگاہ پر چلا آیا۔ لیکن میں اس گفتگو کے بعد برابر یہ سوچتا رہا ہوں کہ اہل مریخ نہ تو گناہ کی لذّت سے آشنا ہیں۔ نہ ہم نے بدی کا آرزو انگیز چہرہ دیکھا ہے نہ ہم نے چوری کی ہے۔ نہ جھوٹ بولا ہے۔ کیا اُسے توبیخ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس پرسکون اور بے کیف زندگی کو کچھ عرصے کے لئے ختم کر دیا جائے اور ہم بھی اہلِ زمین کی پیروی میں اپنے آپ پر ایسی زندگی مستول کر لیں جو یکسر ہنگامہ ہو۔

عورتوں کا جلسہ

سارُوس کے بیٹے توبیغ کو زرینخ ابن بلاطیس کا سلام پہنچے۔ اے دوست میں اس سیارے میں صرف چند دن اور رہوں۔ یہاں دیکھنے کی جو چیزیں تھیں۔ سب دیکھ چکا۔ دور دور کے شہروں سے ہو آیا لیکن ساری دنیا کو دیکھنا برسوں کا کام ہے۔ اور پھر ان دنوں زمین کے مختلف حصّوں میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ آمدو رفت کے راستے بند ہیں اور اگر میں اپنے نرالے پر بیٹھ کے دنیا دیکھنے کے ارادے سے چل بھی نکلوں۔ تو اس میں ہلاک ہو جانے کا ڈر ہے۔ اس لئے فی الحال ہندوستان کی سیر پر ہی قناعت کرتا ہوں۔ موقع ملا تو پھر آؤں گا۔ دنیا کے ایک ایک ملک میں

گھوموں گا۔ دیس دیس کی سیر کرونگا۔

پچھلے ہفتے میں نے چیزیں تو بہت سی دیکھیں۔ طرح طرح کے لوگوں سے ملا جلسوں اور تماشہ گاہوں میں گیا۔ شادمانی کے قہقہے بھی سنے انسانیت کے رستے ناسوروں کو بھی دیکھا۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز عورتوں کا ایک جلسہ تھا یہ تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ کہ اس دیار میں جہاں بڑے بڑے اختلافات ہیں۔ وہاں عورتوں اور مردوں کی زندگی کے دائرے بھی الگ الگ ہیں۔ دونوں کے مشاغل جداگانہ مسایل مختلف۔ عورتوں کے ذمے پکانا ریندھنا اور بچوں کی پرورش کرنا ہے۔ اور مرد کا کام صرف کمانا۔ متوسط اور امیر طبقے میں ابھی تک پردے کا رواج ہے یعنی عورتیں گھروں میں رہتی ہیں۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ کہیں گھر سے نکلنے کی ایسی ہی ضرورت پیش آئی اور چہرے پہ نقاب ڈال لیا۔ اگر بدصورت عورتوں بلکہ بدصورت مردوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں نے تو یہی دیکھا اور سنا ہے۔ کہ اکثر حسین عورتیں تو پردے میں ہیں۔ اور اکثر بدصورت عورتیں آزادانہ بے حجاب پھرتی ہیں۔ سچ پوچھو تو پردے کی یہ رسم میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ایک پردے پر کیا موقوف ہے اس دنیا کی بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ جو نہ کبھی میری سمجھ میں آئی ہیں۔ نہ آسکتی ہیں۔

عورتوں کا جلسہ

ایک عجیب چیز یہ ہے کہ یہاں جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں رنگارنگی نظر آتی ہے۔ وہاں عورتوں میں بھی عجیب قسم کی رنگارنگی ہے۔ یعنی کچھ تو ایسی ہیں جن کے لئے گھر سے قدم نکالنا قیامت ہے۔ پکانے ریندھنے سینے پرونے بچوں کی غور و پرداخت کرنے کے سوا دنیا کے کسی معاملے سے سروکار ہی نہیں۔ اور کچھ ایسی ہیں جنہیں مردوں سے برابری ہی کا نہیں بلکہ ان سے بہتر ہونے کا دعوے ہے۔ یہ چاہیں تو سورج کو درخشانی اور چاند کو بھی تابانی بخش دیں۔ صبا کو خرام ناز سکھائیں۔ دریا کو روانی کی تعلیم دیں شعلوں پہ زبان طعن دراز ہے کہ انہیں چٹکنا نہیں آتا۔ کلیوں پر عتاب ہو رہا ہے کہ انہیں مسکرانے کا سلیقہ نہیں۔ جن مسائل کے متعلق مردوں کو کچھ کہنے سننے کا حوصلہ نہیں پڑتا اُن پر یہ پہروں گفتگو کر سکتی ہیں۔ عورتوں کے انداز فکر میں اس قسم کی رنگارنگی اور بوقلمونی دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی لیکن کسی قدر کد و کاوش کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی۔ یہاں ذرائع رسل و رسائل میں ابھی اتنی آسانی نہیں جتنی ہمارے ہاں موجود ہے۔ وہ مریخ کی سی بات کہاں کہ پلک جھپکتے میں سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر ڈالی۔ ساحلِ بحر سے شمال کے کوہستانوں تک ہو آئے۔ یہاں تو علاقے علاقے کی بولی الگ ہے۔ ملک ملک کی تہذیب جداگانہ۔ شید وش کبیر کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا۔ جہاں کہیں دو تہذیبوں میں خلا ملا شروع ہوتا ہے۔ اکثر

اسی قسم کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہندوستان کرۂ ارض کے مشرقی حصے میں ہے۔ یہاں کی تہذیب پرانی اندازِ نگاہ پرانا۔ خیالات پرانے مغربی حصے کے لوگ زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اُن کے یہاں نہ پردہ ہے۔ نہ عورتیں گھروں کی چاردیواری میں بند ہیں۔ پھر وہاں کے لوگوں کے دلوں پر مذہب کا بھی اتنا اثر نہیں۔

اب کچھ عرصے سے مشرق اور مغرب کے لوگوں کو آپس میں ملنے جلنے ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنے۔ ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہونے کا موقعہ مل رہا ہے مغرب کی تہذیب نے تو مشرق سے چنداں اثر قبول نہیں کیا ہاں مشرق آہستہ آہستہ ان کے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ لیکن سب کو مِل جُل کے یکساں مواقع میسر نہیں۔ کہیں کم اثر پڑا ہے۔ کہیں زیادہ کہیں بالکل نہیں پھر بعض نے صرف مغربی تہذیب کی برائیوں ہی کی نقل کی ہے۔ بعض نے اسے پوری طرح اپنایا ہے۔ یعنی بعض پورے نقال ہیں۔ بعض ادھورے۔ بعض نے سمجھ سوچ کے نقل اتاری ہے۔ بعض نے بے سوچے سمجھے۔ کچھ دائرے کے اندر رہے۔ کچھ دائرے سے باہر نکل گئے۔ اکثر نے پوست کو مغز سمجھا۔ کوئی کوئی ایسا بھی نکل آیا۔ جس نے پوست اور مغز کے فرق کو پہچانا۔ اس دنیا میں آنکھوں

والے کم ہیں۔ اندھے زیادہ۔ جس ڈھرّے پر چل نکلے۔ چل نکلے۔ کیا مجال کہ ذرہ بھر اِدھر اُدھر ہو جائیں۔ یہ طوفان ایسا امڈا ہے۔ کہ مرد اور عورت، دونوں اسی رَو میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

ہاں تو میں عورتوں کے جلسے کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔ اور آمدِ سخن میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ تو اب جلسے کا ذکر سنو۔ کہنے کو تو یہ عورتوں کا جلسہ تھا لیکن اس میں مرد بھی شریک تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھ سمیت ان سب بچاروں کی حیثیت محض تماشائیوں کی تھی یعنی بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دن کے جلسے کا ذکر ہے رات کو جو جلسہ ہوا اُس میں صرف عورتیں ہی شریک تھیں۔ گویا وہ بزمِ خاص تھی۔ یہ بزمِ عام پھر بھی جلسے میں بہت کم لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ زیادہ تر عورتیں ہی تھیں۔ یہ نہ سمجھو کہ جو پردے والیاں گھر سے باہر قدم رکھنے کو گناہ سمجھتی ہیں۔ وہ بھی اس جلسے میں موجود تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ پردے کے بھی کئی مدارج ہیں بعض خواتین کا یہ حال ہے کہ اپنے کپڑے مرد سے نہیں دھلوائیں۔ برتن قلعی کروانے میں بھی کلام ہے۔ باہر نکلیں گی تو ڈولی میں بیٹھ کے تاکہ لباس تک پر اِیا مرد نہ دیکھنے پائے۔ ہوا تک نہ لگے۔ بعض اتنی محتاط نہیں۔ یعنی نقاب اوڑھ کر باہر نکلنے کو معیوب نہیں جانتیں۔ اس جلسے میں ایسی خواتین بکثرت موجود تھیں۔ لیکن بے حجاب

عورتوں کی تعداد بھی اُن سے کچھ کم نہیں تھی۔ اچھا خاصا اجتماع تھا جدھر نظر اٹھتی تھی۔ رنگا رنگ ساڑھیاں اور برقعے نظر آ رہے تھے۔ جلسے کی صدر ایک صاحبزادی تھیں۔ جو شعر کہتی ہیں۔ مضمون لکھتی ہیں۔ پیانو بجاتی ہیں۔ مغربی موسیقی اور مغربی ادب میں خاصا دخل رکھتی ہیں۔ زور کی تقریریں کرتی ہیں۔ اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بڑی عزت اور قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ جس طرح جلسے میں برقعے اور ساریاں اس طرح گھل مل گئی تھیں۔ کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح پروگرام میں برقعے بھی موجود تھے۔ اور ساریاں بھی یعنی دونو گروہوں کے مذاق کی رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ یعنی نظمیں بھی تھیں۔ گیت بھی۔ عورتوں کے حقوق اور عورت مرد کی مساوات پر تقریریں بھی تھیں۔ ایک قرارداد میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔ کہ اسمبلی میں عورتوں کی نشستیں پچاس فی صدی ہونی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے سینے پرونے پر بھی تقریریں ہوئیں۔ مثلاً مختلف کھانوں کا ذکر چھڑا۔ یہ معاملہ بھی معرضِ بحث میں آیا کہ پلاؤ اچھا ہے یا بریانی اور بریانی میں مسالہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ نرگسی کوفتے کیونکر پکتے ہیں۔ روغن جوش اور قورمے میں کیا فرق ہے۔ مچھلی کا کانٹا کس طرح گلایا جا سکتا ہے۔ کاڑھے بننے کا قصہ سامنے آیا۔ تو ایک تقریر میں ننھے کے مفلر سے بڑے میاں کے سویٹر تک کی ترکیبیں آگئیں۔ اس کے بعد

سے فرصت ملی۔ تو یہ سوال چھڑ گیا۔ کہ کپڑے پر چکنائی کے دھبے پڑ جائیں تو انہیں کیونکر دور کیا جائے۔ فرنیچر کو کس طرح صاف کرنا چاہیے۔ دری سے دھبے چھڑانے کی کیا ترکیب ہے۔ چہرے کے داغ اور جھائیں کیونکر دور ہو سکتے ہیں۔ بال لمبے کرنے کے لئے کونسا تیل استعمال کرنا چاہیے۔ سرمہ کونسا اچھا ہے۔ عورتوں کے حقوق اور مرد اور عورت کی مساوات کے ساتھ ساتھ نمک مرچ پیاز ہلدی لہسن قورمہ بریانی دوپیازہ۔ قبولی۔ کھچڑی۔ آلو کی بھجیا۔ ٹماٹر۔ تارپین کے تیل اور آلو کے چھلکوں کا ذکر ایسا ان میل بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ کہ مجھے تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں اس خیال میں تھا کہ اب یہ قرارداد پیش ہو گی کہ عورتوں کو کوہ پیمائی میں بھی حصہ لینا چاہیئے۔ کہ ایک صاحبزادی نے نظم پڑھنی شروع کر دی اور میں نظم سننے میں ایسا محو ہوا کہ جلسے کی عجوبہ کاریوں کو بھول گیا۔ لیکن بھائی تو یہ اس میں ان بیچاریوں کا کیا قصور ہے۔ یہ عورتوں کے دو گروہ ہیں ایک پرانا ایک نیا۔ نئے گروہ کو حق طلبی کا شوق ہے۔ پرانے گروہ کو پکانے ریندھنے سینے پرونے بننے کاڑھنے سے فرصت نہیں۔ جب تک پرانے گروہ کے مذاق کا خیال نہ رکھا جائے۔ ایسے جلسے کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس قصے میں ان لوگوں کو اس بات کا خیال نہیں رہتا۔ کہ عورت کو اگر ہر بات میں مرد کی برابری کرنا ہے۔ تو گھر بار کا انتظام اور کاڑھنے بننے کھانے پکانے کے بکھیڑوں

سے اُسے قطع تعلق کرنا پڑے گا۔ اور اگر عورت کی سرگرمیوں کا دائرہ گھر تک محدود ہے۔ تو حق طلبی کا یہ غلغلہ بے معنی ہے۔

ایک بات میں نے اور بھی دیکھی ہے۔ عورتوں کو بعض حقوق ایسے بھی حاصل ہیں کہ جو مردوں کو حاصل نہیں عورتوں کو جنسِ ضعیف کہا جاتا ہے۔ اور ان کی حفاظت فرض سمجھی جاتی ہے۔ گاڑی کے سفر میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں اتنے میں ایک عورت آجاتی ہے اور کئی مرد خود کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی نشست اُسے پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر عورت جنسِ ضعیف نہیں۔ مرد کی امداد سے بے نیاز ہے۔ اور اپنی حفاظت خود کر سکتی ہے تو اُسے ان رعایتوں سے بھی ہاتھ اُٹھا لینا چاہیے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں آکے میرے خیالات بدل گئے ہیں۔ مرد اور عورت کی مساوات کا قائل نہیں رہا۔ لیکن یہاں یہ سوال جس طرح اٹھایا گیا ہے اس میں کوئی تک نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ اس جلسے سے میری طبیعت مکدر ہوئی جب سے وطن چھٹا ہے۔ عورتوں اور مردوں کو اس طرح کہیں یکجا نہیں دیکھا تھا۔ گیت سنے۔ نظمیں سنیں۔ تقریریں سنیں۔ کھانا پکانے کی بہت سی ترکیبیں معلوم ہوئیں۔ پلاؤ میں ہلدی نہیں ڈالی جاتی۔ بریانی اور ترکیب سے پکتی ہے۔ اور پلاؤ اور ترکیب سے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ عورت مرد کی مساوات کا نسخہ ابھی

طرح سمجھ میں نہیں آیا یہ تو معلوم ہوا کہ اس میں ہلدی کتنی ہونی چاہیئے۔ پیاز کتنی لیکن یہ یاد رکھو کہ اس دیس میں عورت مرد کی مساوات کا سوال حل ہوا۔ کسی ایسی ہی ترکیب سے حل ہوگا۔ جلسے کے بعد آئس کریم چائے اور پھلوں سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ تم جانتے ہو کہ مجھے میٹھی چیزیں بہت پسند ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے آئس کریم کی طرف توجہ کی۔ صدر جلسہ مجھے غریب الدیار سمجھ کے میرے سامنے آ بیٹھیں۔ عورتوں کے حقوق کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں آئس کریم کھاتا جاتا۔ اور باتیں سنتا جاتا تھا۔ آئس کریم اتنی میٹھی تھی کہ ہونٹ جڑے جاتے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہ حلاوت دراصل آئس کریم میں تھی یا صدر صاحبہ کی باتوں میں۔

رخصت

سارُوس کے بیٹے نوبخ کو جو وادی ترامید کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ ہوشمند ہے اُس کے دور افتادہ بھائی اور دوست زینغ ابن بلاطیس کا سلام پہنچے۔ اے دوست کرۂ زمین سے یہ میرا آخری خط ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے پہنچنے سے بہت پہلے میں تم لوگوں کے درمیان اس طرح اچانک آ پہنچوں۔ کہ تم سب مجھے دیکھ کر حیران رہ جاؤ۔ کیونکہ میں نے اس سیارے کو جلد خیرباد کہنے کا ارادہ کر لیا ہے لیکن تم جانتے ہو کہ کائنات میں جو قوتیں برسرِکار ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے اختیارات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے مستقبل کے بارے میں کوئی بات پورے یقین اور وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ بہت ممکن ہے کہ میرا فرار دہ خلائے بسیط میں پرواز کرتا کسی نامعلوم سیارے میں جا اُترے اور فراق کا یہ زمانہ زیادہ

طویل ہو جائے۔ یا وہ اسی راستے میں کسی شہاب ثاقب سے ٹکرا جائے اور میری خاکستر اس فضائے نیلگوں کی وسعتوں میں پریشان ہو کر رہ جائے۔

بہرحال اِس وقت جبکہ میں سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوں میرے دل پر ایک ناقابلِ بیان خوف سا چھایا جا رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ میں سکونت یہیں اختیار کر لوں یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک بہت ترقی یافتہ سیارے کا باشندہ ہوں لیکن مریخ کی زندگی میں کرۂ زمین کی سی کشمکش رنگا رنگی اور ہما ہمی کہاں ہے۔ وہاں اتحاد ہے اعتدال ہے۔ یکسانی ہے۔ یکرنگی ہے۔ سکون ہے۔ یہاں عناد ہے اختلاف ہے۔ شور ہے۔ اضطراب ہے۔ بوقلمونی ہے۔ لیکن سکون کو اضطراب پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ بھی تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر مریخ کی یکرنگی اور یکسانی نے ہمیں اکتاہٹ اور بیزاری کے سوا اور کیا بخشا ہے۔ اس سکون و اعتدال سے ہمیں بے کیفی کے سوا اور کیا حاصل ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک قطعہ آب کو جس میں نہ کبھی طوفان آئے۔ نہ کبھی کوئی لہر اُٹھے متلاطم اور پُرخروش سمندر سے کیوں بہتر سمجھا جائے۔ جس کی موجیں بڑے بڑے جہازوں کو گیند کی طرح اچھال دیتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھو کہ میں نے اس سیارے میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اگرچہ میں نے بہت حد تک اپنے آپ کو ان لوگوں کی معاشرت کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ میں ان کی زبان

میں باتیں کرتا ہوں۔ اُن کا سا لباس پہنتا ہوں نشست و برخاست کے آداب میں اُن کی پیروی کرتا ہوں وہ جھک کے آداب بجا لاتے ہیں۔ تو میں بھی جھک کے آداب بجا لاتا ہوں۔ وہ ہنستے ہیں۔ تو میں ایک قہقہے سے ان کا ساتھ دیتا ہوں وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ تو میں بھی چہرہ پر تاسف کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی میں نہیں سمجھ سکا کہ جن چیزوں پہ نہیں افسوس ہوتا ہے ان پر کیوں افسوس ظاہر کیا جائے۔ اگر میں احتیاط نہ برتوں تو بہت ممکن ہے کہ جن موقعوں پر وہ ہنستے ہیں میں بے اختیار رو پڑوں اور جن حالات میں ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں میں قہقہے لگانا شروع کر دوں۔

میرے اور اُن کے درمیان اجنبیت کا ایک حجاب حائل ہے۔ اِس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ زمین سے جلد چل پڑوں۔ اور ان لوگوں کے درمیان اپنی زندگی کے باقی دن گذاروں جو میرے جذبات کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ زمین پر میں نے جو دن گزارے ہیں۔ ان کی یاد ہمیشہ ایک مضطرب روح کی طرح میرے پیچھے لگی رہے گی جو راتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے مجھے جگا دے گی میرے کان فضائے لامتناہی کے اس پار ہمیشہ ایک آواز کے منتظر رہیں گے۔ اور ان لمحوں کی یاد جو میں نے زمین پہ گزارے ہیں۔ میرے دل میں ہمیشہ چٹکیاں لیتی رہے گی اہل زمین میں سے جن لوگوں کے ساتھ مجھے یک گونہ تعلق خاطر ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے

کہ میں واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں نے اُنہیں اپنی روانگی کا صحیح وقت نہیں بتایا۔ کیونکہ میں جب یہ ذکر چھیڑتا ہوں تو انہیں سخت اذیت ہوتی ہے۔ میں یہاں سے چلتے وقت مایوس اور افسردہ لوگوں کی ایک قطار نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ ان میں بعض چہرے عزم شکن اور تاب گسل ہیں۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے پرواز کی طاقت بھی نہ چھین لیں۔ ان میں ایک تو وہ لڑکی ہے۔ جس کا ذکر میں پہلے کسی خط میں کر چکا ہوں۔ تو زرنیخ تمہیں سن کے تعجب ہوگا کہ وہ زمین کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئی ہے لیکن میں اُس کی زندگی کو برباد کرنا نہیں چاہتا کیا وہ مریخ میں ہم لوگوں کے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ ہرگز نہیں وہ ہمارے تمدن و معاشرت اور ہمارے خیالات پر اس طرح تعجب کرے گی جس طرح میں اہلِ زمین کی معاشرت اور خیالات پر تعجب کرتا ہوں وہ مریخ اور اہلِ مریخ سے اُکتا جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ اس نے جو خواب و خیال کی دنیا تعمیر کر رکھی ہے۔ اسے برباد ہوتا دیکھ کے خود کو ہلاک کر ڈالے۔

سب سے زیادہ تو ایک شاعر صاحب نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ ان صاحب کو یہ دُھن ہے کہ میں ان کے کلام کا ترجمہ مریخ کی زبان میں کر ڈالوں اور وطن پہنچتے ہی اُسے چھپوا دوں۔ ان کو یقین ہے کہ اگر مریخی زبان میں ان کی نظمیں چھپ گئیں

تو انہیں اہلِ مریخ کی طرف سے ملک الشعرا کا خطاب مل جائے گا۔ پرسوں
انہوں نے یہ ذکر چھیڑا تو میں نے پوچھا کیا زمین کی تمام زبانوں میں آپکے کلام
کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ کہنے لگے نہیں تو۔ میں نے کہا تو آپ پہلے یہاں کی مختلف زبانوں
میں اپنی نظموں کا ترجمہ کروا کے اہلِ زمین سے ملک الشعرائے زمین کا خطاب کیوں
نہیں حاصل کرتے۔ کہنے لگے اجی زریخ صاحب اہلِ زمین میرا کلام کیا سمجھیں گے۔
ہمارا سیارہ تو جاہلوں سے بھرا پڑا ہے۔ قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ایسے ایسے شعر
کہے ہیں کہ کوئی دوسرا شاعر کہہ دے تو خون تھوکنے لگے۔ لیکن اہلِ زمین کی سمجھ ہی میں
کچھ نہیں آتا اور بیچاروں کی سمجھ میں کیا آئے اس کے لئے بڑی عقل و فہم کی ضرورت
ہے۔ اب ان لوگوں سے اپنی شاعری منوانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ پہلے
مریخ کی زبان میں میرا کلام چھپے جب مریخیوں نے مجھے ملک الشعرا مان لیا تو زمین
والوں کو بھی مجبوراً میری شاعری پر ایمان لانا پڑے گا۔ سمجھ گئے آپ ذرا میری
اُپج کی داد دیجئے گا۔ آخر میں شاعر ہوں شاعر کوئی گھس کھدا تو نہیں۔ اہلِ مریخ
کی شعر فہمی کے متعلق۔ انہوں نے یہ رائے اس لئے قائم کر لی ہے۔ کہ میں نے دو
ایک موقعوں پر ان کے کلام کی بے محل کے داد دی ہے۔ اور اگرچہ یہ داد محض
رسماً اور اخلاقاً تھی لیکن اس کے بعد یہ صاحب ایسے پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑے

ہیں کہ اب ان سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہر شخص سے یہی کہتے ہیں کہ میرے کلام کو تو صرف زرنیخ ہی سمجھ سکتا ہے۔

اہلِ زمین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو میرے عزم سفر کی خبر سنکر تحفوں کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ایک صاحب کل تشریف لائے تھے۔ انہوں نے تحفوں کی اچھی خاصی فہرست تیار کر رکھی ہے۔ خیر ان میں بعض چیزیں تو واقعی زمین کے نوادر میں سے ہیں۔ لیکن انہیں اس پہ بھی اصرار ہے کہ لمبا سفر ہے۔ اس لئے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ساتھ ہونی چاہئیں۔ فرماتے تھے کہ ایک مشہور حلوائی سے لڈو بنوائے ہیں۔ یقین ہے کہ آپ کو پسند آئیں گے۔ کچھ راستے میں کھا لیجئے گا۔ جو باقی بچیں وہ گھر پہنچکر بال بچوں میں تقسیم کر دیجئے گا۔ اتنی دور سے خالی ہاتھ گھر جانا اچھا نہیں۔ آخر لوگ کیا کہیں گے۔ اجی صاحب جس حلوائی سے میں نے لڈو بنوائے ہیں۔ اُس کے نام کے جھنڈے ہمارے ملک میں گڑے ہیں۔ بس ہمارے شہر میں یہی ایک حلوائی اگلے وقتوں کی یادگار باقی رہ گیا ہے۔ سو یہ بچارا بھی چراغِ سحری ہو رہا ہے۔ اور ہاں آپ کے لئے میں مٹی کی ایک نفیس صراحی بھی لایا ہوں۔ سفر میں صراحی ضرور ساتھ ہونی چاہیئے میں تو ہمیشہ اس کا انتظام کرتا ہوں اگرچہ دِلّی کا سفر ہوتا ہے۔ راستے میں ہر اسٹیشن

پر پانی برف سوڈا ہو جاہو مل سکتا ہے۔ پھر بھی جب تک صراحی ساتھ نہ ہو
ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی عزیز چیز کھو بیٹھا ہوں۔ اب انہیں کیا بتاؤں کہ اوّل
تو مجھے پانی کی ضرورت نہیں اور اگر پانی لے بھی جاؤں تو کب تک کفالت کرے گا۔
وہ صراحی کی تعریف کرتے جاتے ہیں۔ اور میں مجبوراً ان کی ہاں میں ہاں ملاتا جاتا
ہوں۔ ایک صاحب جو افغان ہیں یعنی ہندوستان شمال مغربی کے باشندے
اکثر مجھے ملنے آتے ہیں۔ پہلے دن آئے تو فرمایا دیکھو بابو زر بیغ ام تمہارا بوت
تعریف سنا۔ تم اما را مہمان ہے۔ ام تمہارا واسطے کشمش لایا۔ پستہ لایا بادام لایا
چلغوزہ لایا۔ اس کے بعد جب تشریف لائے خالی ہاتھ نہیں آئے پرسوں
انہوں نے میری روانگی کی خبر سنی۔ تو وہ دوڑے دوڑے آئے بادام چلغوزہ اور
کشمش کی ایک بوری ساتھ تھی۔ میں نے پوچھا خان صاحب کیا ہے۔ کہنے
لگے ام تمہارا واسطے بادام اور چلغوزہ لایا۔ اس کو لے جاؤ اور جب بادام کا
ضرورت ہو خان کو لکھو۔ خان تمہارا دوست ہے دوست۔

ان لوگوں کی مروت اور اخلاق دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ کہ یہ
زمین کے بسنے والے مروت سے بیگانہ۔ وضعداری سے نا آشنا۔
قتل سے یہ نہیں چوکتے۔ رہزنی میں انہیں باک نہیں۔ لیکن مجھ غریب الوطن

سے اس مہر و مروت کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ گویا میں انہی کے کنبے کا فرد ہوں۔ بعض خواتین نے میرے لئے تکیوں کے غلاف اور رومال کاڑھے ہیں اور اس پر بضد ہیں کہ سب کچھ اُٹھا کر مریخ میں پہنچا دیا جائے۔ ان کے خلوص کو دیکھتا ہوں تو یہ کہنے کا حوصلہ نہیں پڑتا کہ مریخ والوں کے لئے یہ سب چیزیں بیکار ہیں۔ مجبوراً تعریف کرتا ہوں۔ داد دیتا ہوں۔ اور اُن کی ہُنرمندی پہ تعریف کرنے کو جی چاہے نہ چاہے ان کے خلوص کا خیال آتا ہے۔ تو دل گداز ہو جاتا ہے۔

رات ختم ہونے کو ہے تارے جھلملا رہے ہیں۔ اور رات کے خاتمہ کے ساتھ یہ سہانا خواب بھی ختم ہونے کو ہے۔ سلام ہے تم پر اے کرۂ ارض کے باسیو سلام ہے تم پر اے شہرستان مہر و وفا کے مکینو بلاطیس کا بیٹا زرنیخ تم سے رخصت ہوتا ہے۔

کتابخانہ احمد ہادی موسیٰ